''مائی برادر'' محترمہ فاطمہ جناح کی واحد تصنیف

پروفیسر شریف المجاہد

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں محترمہ فاطمہ جناح نے دو تین بار یہ اعلان کیا تھا کہ ان کی زیر نگرانی قائداعظم کی ایک مستند سوانح حیات زیر ترتیب ہے لیکن جب تک ان کی خودنوشت ''مائی برادر (My Brother) کا مسودہ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں محترمہ کے دستاویزات (Papers) سے دستیاب نہیں ہوا کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ آیا محترمہ کی زندگی میں اس پروجیکٹ پر کوئی پیش قدمی ہوئی یا نہیں۔ ۱۹۸۸ء میں راقم الحروف نے بحیثیت ڈائریکٹر، قائداعظم اکادمی اس مسودہ کو نیشنل آرکیوز آف پاکستان سے حاصل کیا اور اسے مع حرف آغاز، ضمیمہ جات اور مندرجات پر مشتمل ایک مکمل مطالعہ کی حیثیت کے طور پر پائے تکمیل کو پہنچایا اور اسے انگریزی، اردو، سندھی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ امر باعث توجہ ہے کہ آج بھی اس مطالعہ کو قائداعظم کی زندگی کے چند کلیدی واقعات پر ایک مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

اس سے قبل کہ محترمہ کی اس تصنیف کو زیر بحث لایا جائے یہ امر ضروری ہے کہ خود محترمہ کی زندگی کے چند اہم واقعات اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

محترمہ، قائداعظم محمد علی جناح کے سات بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھیں لیکن اس اعتبار سے وہ واحد تھیں جو نہ صرف اپنے قد آور بھائی سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی تھیں بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی ان سے زیادہ قریب تھیں۔ ان کے والد جناح پونجا کے غالباً ۱۹۰۱ء میں انتقال کے بعد قائداعظم ہی محترمہ فاطمہ جناح کے سرپرست قرار پائے اور انہوں نے اپنی اس حیثیت میں فاطمہ جناح کی تعلیم کی تکمیل میں بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔ یہ قائداعظم کی ہی غیر معمولی دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے خاندان کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود اس وقت یعنی ۱۹۰۲ء میں فاطمہ جناح کو باندرہ کانونٹ اور بعد ازاں ۱۹۱۹ء میں کلکتہ کے ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج میں داخلہ دلوایا جب کہ خوجہ لڑکی کا کانونٹ یا ایک پیشہ ور تربیتی کالج میں داخلہ لینا روایتی اقدار کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر جب فاطمہ جناح فارغ التحصیل ہوئیں تو جناح نے بمبئی میں ایک ڈینٹل کلینک کھولنے کے خیال کی نہ صرف تائید کی بلکہ ۱۹۲۳ء میں اس خیال کو عملی شکل دینے میں فاطمہ جناح کی معاونت بھی کی۔

قائداعظم محمد علی جناح کی ۱۹۱۸ء میں رتن بائی سے شادی تک تقریباً آٹھ سال محترمہ فاطمہ جناح اپنے

بھائی کے ساتھ مقیم رہیں۔ پھر فروری ۱۹۲۹ء میں رتن بائی کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنا کلینک بند کر دیا اور وہ قائداعظم جناح کے مکان میں نہ صرف منتقل ہوگئیں بلکہ انہوں نے گھر کا تمام انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں سے محترمہ فاطمہ جناح اور قائداعظم کی وہ طویل رفاقت شروع ہوتی ہے جو ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کے انتقال تک برقرار رہتی ہے۔

مجموعی طور پر محترمہ فاطمہ جناح اپنے بھائی کے ساتھ ہمہ وقت تقریباً ۲۷، ۲۸ سال رہیں، اس مدت میں وہ آخری ۱۹½ سال بھی شامل ہیں جو جناح کی زندگی کے ہر اعتبار سے بہت زیادہ مصروف اور تھکا دینے والے سال تھے۔ ان سالوں کے دوران جب قائداعظم نہایت آہستگی اور ڈرامائی انداز میں ایک مکمل سیاسی علیحدگی (خصوصاً ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء کے دوران خود عائد کردہ جلاوطنی کے پردے سے نکل کر) دس کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ایک نئی قوم کے مصدقہ قائد کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ جب انہوں نے شکست کو فتح میں تبدیل کیا۔ جب انہوں نے مسلم قوم کے لیے طویل اور صبر آزما جدوجہد کا آغاز کیا تاکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان اقتدار کی تقسیم کے لیے اصولوں پر مبنی اور مساویانہ ایک ایسا لائحہ عمل تلاش کر سکیں جو برصغیر کے ماحول میں ایک نئے طرز سیاست پر منتج ہو۔ محترمہ فاطمہ جناح نہ صرف اپنے بھائی کے ساتھ ان کے گھر مقیم رہیں بلکہ ان کے ساتھ بے شمار دوروں میں بھی شریک سفر رہیں، جس سے ان کے اندر اس عظیم ترین جدوجہد کا فہم وادراک پیدا ہوا جس کی سمت جناح گامزن تھے۔ اس امر کی بھی شہادت ملتی ہے کہ جناح محترمہ کے ساتھ مختلف سیاسی وانتظامی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ یہ تبادلۂ خیالات عموماً ناشتہ اور رات کے کھانے کے وقت ہوا کرتے تھے۔ وہ محترمہ فاطمہ جناح پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے۔ انہوں نے فاطمہ جناح کے لیے کہا کہ! وہ میرے لیے اس وقت امید، ہمت اور معاونت کا ایک مستقل ذریعہ ثابت ہوئیں جب ہم ایک بڑے انقلاب سے ہمکنار ہو رہے تھے''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نامور بھائی قائداعظم محمد علی جناح کی سوانح لکھنے یا مرتب کرنے کا خیال محترمہ فاطمہ جناح کو اس وقت آیا جب ۱۹۵۲ء میں ہیکٹر بولائتھو کی کتاب ''جناح'' زیر ترتیب تھی۔ منجملہ وہ ایک اچھی سوانح تھی اور اس کا انحصار زیادہ تر جناح کے ہم پیشہ مقربین، سیاسی رفقاء اور مبصرین، حتیٰ کہ جناح کے ان معاصرین کی ذاتی یادداشتوں وتاثرات پر تھا جو جناح کی طویل ترین پیشہ ورانہ اور سیاسی زندگی کے دوران کسی بھی عنوان سے جناح کے ساتھ وابستہ رہے البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بولائتھو کی کتاب جناح کی وہ حقیقی تصویر پیش کرنے میں کسی حد تک ناکام رہی جو ۱۹۳۷ء۔۱۹۴۷ء کے دوران ان کی عظیم الشان سیاسی جدوجہد اور کارناموں کی روشنی میں سامنے آتی ہے۔

بولائتھو کی کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد ہی محترمہ فاطمہ جناح نے ایک ایسے پاکستانی مصنف کی تلاش

شروع کر دی جو قائد کی سوانح پر کام کر سکے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ صرف ایک پاکستانی اور خصوصاً ایک ایسا پاکستانی جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے تاریخ ساز عشرے کے دوران مسلم سیاست کے بارے میں مکمل اور مؤثر بصیرت سے مزین ہو، وہ ہی اس پیچیدہ عشرہ کی منظر کشی اور قائد اور ان کے مشن کے ساتھ انصاف کرنے کا کما حقہ، اہل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں فاطمہ جناح کا پہلا انتخاب اسلامیہ کالج، کلکتہ کے سابق پرنسپل اور بعد ازاں راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پروفیسر عشرت حسین زبیری تھے۔ جب پروفیسر زبیری ۵۹۔۱۹۵۸ء میں بوجوہ امریکہ چلے گئے تو فاطمہ جناح نے اس مقصد کے لیے جسٹس ایم آر کیانی کو منتخب کیا۔ لیکن جسٹس کیانی ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو اچانک انتقال کر گئے چنانچہ اب فاطمہ جناح کی نگاہ انتخاب جی الانہ پر پڑی۔ جی الانہ نے تقریباً اٹھارہ ماہ فاطمہ جناح کی معاونت کی لیکن ۱۹۶۴ء کے اواخر میں اس وقت ج فاطمہ جناح کو حزب اختلاف کے نمائندہ کی حیثیت سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑنے پر آمادہ کیا گیا تو یہ سلسلہ چند ایسی وجوہات کی بنا پر منقطع ہو گیا جو آج بھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مشترکہ منصوبے کے انقطاع کے بعد بھی فریقین میں سے کوئی بھی قائداعظم کی سوانح کے منصوبہ سے دستبردار نہیں ہوا۔ جہاں فاطمہ جناح اپنے انتقال ۸ جولائی ۱۹۶۷ء تک ایک ایسا مناسب مصنف کی تلاش میں مصروف رہیں، وہاں جی الانہ بھی قائداعظم کی ایک سوانح عمری لکھنے کے ارادے پر قائم رہے اور فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد ان کی ایک کتاب ''قائداعظم جناح: دی اسٹوری آف اے نیشن'' منظر عام پر آئی جو ایک پاکستانی مصنف کی تحریر کردہ قائداعظم کی ایک عمدہ سوانح عمری ہے۔

پیش نظر کتاب کا مسودہ محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد ان کی رہائش گاہ ''موہتہ پیلس'' سے دستاویزات قائداعظم کے ساتھ برآمد ہوا تھا اور اسلام آباد میں نیشنل آرکائیوز آف پاکستان میں محفوظ تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ مسودہ ۱۹۶۳ء۔۱۹۶۴ء کے دوران تحریر کیا گیا۔ جس کا ثبوت اس کے سرورق سے بھی ملتا ہے جس پر تحریر ہے کہ یہ مسودہ فاطمہ جناح نے جی الانہ کے تعاون سے مکمل کیا تھا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کے پاس معلومات کا ذخیرہ تھا جو اس مسودہ میں موجود ہیں اور جن کو انہوں نے جی الانہ کے تعاون سے نہ صرف مدون کیا بلکہ ان کو قابل مطالعہ بھی بنا دیا۔ یہ مفروضہ دراصل دو ٹھوس حقائق پر مبنی ہے جو راقم الحروف کے علم میں ہیں۔ اول یہ کہ جی الانہ نے ۱۹۶۳ء کے آواخر میں قائد کی سوانح کے منصوبے کی تفصیلات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے راقم الحروف کو دیگر امور کے علاوہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ مل کر قائد کی سوانح پر کام کر رہے ہیں اور ابتدائی دو ابواب جو قائداعظم کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی سالوں کے بارے میں ہیں فاطمہ جناح کی تصنیف ہیں۔ دوم جی الانہ کی تصنیف کردہ جناح کی سوانح میں متعدد طویل

اقتباسات ایسے موجود ہیں جو بڑی حد تک موجودہ مسودہ سے مطابقت ومماثلت ہیں اور جو بغیر توسین وحوالے کے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کا مسودہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب قائداعظم کی زندگی کے آخری سال کے بارے میں ہے جس میں خصوصی طور پر ان کی گرتی ہوئی صحت کے باوجود ان کی پاکستان کے لیے جاں نثاری کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب قائداعظم کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرا باب ان کے لندن میں قیام اور بمبئی میں ان کے ابتدائی سالوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے جب وہ بحیثیت وکیل اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ اگرچہ دوسرے اور تیسرے ابواب میں بڑی حد تک غیر مطبوعہ مواد شامل ہے لیکن پہلے باب کا آخری حصہ زیادہ تر الٰہی بخش کے اس بیان کی تفصیلات کی تصدیق کرتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ''قائداعظم کے آخری ایام'' مطبوعہ ۱۹۴۹ء میں درج کی ہیں۔

یہ مسودہ جب سے محققین کو دستیاب ہوا ہے، جناح کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایک معتبر ذریعہ معلومات کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ خصوصی طور پر اس مسودہ کے کثیر حوالے اسٹینلے والپرٹ نے اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' مطبوعہ ۱۹۸۴ء میں دیئے ہیں جبکہ ''پاکستان: پاسٹ اینڈ پریزنٹ'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء نامی کتاب میں اس مسودہ کی تدوین اور کسی حد تک تلخیص شامل کی گئی ہے لیکن اس کو محققین کی سطح پر کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

اس کتاب میں قائداعظم کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے گمان غالب یہ ہے کہ وہ سب کچھ فاطمہ جناح نے روزناموں اور کسی دوسرے تحریری مواد کی مدد لیے بغیر اپنے حافظے اور یادداشتوں کی بنیاد پر قلمبند کیا ہے چنانچہ یہ کوئی خاص حیرت کی بات نہیں کہ اگر بسا اوقات کچھ تاریخیں، واقعات اور مقامات کے اندراج میں کوئی سہو نظر آئے۔ ان غیر ارادی اغلاط کے سلسلہ میں جہاں میں نے ضروری سمجھا حوالہ جات میں حقیقی صورت حال واضح کردی گئی ہے مسودہ میں شامل قائداعظم کی تقاریر کے اقتباسات کو ان کی تقاریر کے مطبوعہ مجموعوں اور اصل بیانات (جو دستاویزات کی صورت میں ہیں) سے ملالیا اور پھر ان کو مسودہ میں شامل اقتباسات کی جگہ پر درج کردیا۔ جناح کی آخری علالت کے بارے میں الٰہی بخش کے بیانات کو جہاں ضروری محسوس کیا گیا محترمہ فاطمہ جناح کے بیان کی تصدیق میں حوالہ جات میں شامل کرلیا گیا۔

ان یادداشتوں کے ساتھ کتاب کے آخر میں پندرہ ضمیمے بھی شامل کیے گئے جو دستاویزات کی صورت میں جناح کی ابتدائی زندگی سے بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں پہلا دوسرا اور تیسرا ضمیمہ سندھ مدرستہ الاسلام اور کرسچن مشن اسکول کے رجسٹروں کے متعلقہ صفحات پر مشتمل ہیں ضمیمہ چہارم جناح کو جاری کیا جانے والا برٹش میوزیم کی

لائبریری کا کارڈ ہے جو ۱۰ فروری (۱۸۹۶ء؟) کو جاری ہوا تھا۔ پنجم ۲۵ اپریل ۱۸۹۳ء کو آنریبل سوسائٹی آف لنکنز ان کو دی جانے والی وہ درخواست ہے جس میں جناح نے ابتدائی امتحان کے لیے لاطینی زبان سے ان کو مستثنیٰ قرار دینے کی اپیل کی ہے۔ ششم اسی تاریخ کو لنکنز ان کی کونسل کی جانب سے جناح کی درخواست پر رضامندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہشتم ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء کو ابتدائی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بارے میں نوٹیفکیشن ہے۔ ہفتم ۱۴، اپریل ۱۸۹۶ء کو جاری ہونے والا لنکنز ان کا نوٹیفکیشن ہے جس میں ان کے سوسائٹی کے ریکارڈ میں نام تبدیل کر کے ''محمد علی جناح'' کرنے کی درخواست کی منظوری دی گئی ہے۔ نہم لنکنز ان سے ۱۱ مئی ۱۸۹۶ء کو جاری کیا جانے والا نوٹیفکیشن ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محمد علی جناح کو وکالت کی اجازت دینے کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ دہم لنکنز ان سے جناح کو جاری ہونے والا سرٹیفکیٹ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۵، جون ۱۸۹۳ء کو لنکنز ان میں داخل ہوئے اور ۲۹، اپریل ۱۸۹۶ء کو وکالت کے اہل ہو گئے۔ گیارہ اور بارہ محمد علی جناح کے اساتذہ سر ہاورڈ ڈبلیو الفنسٹن اور ڈبلیو ڈگلس ایڈورڈ کے بالترتیب ۵ اور ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو جاری کردہ سرٹیفکیٹ ہیں۔ تیرھواں، بمبئی ہائیکورٹ کے رجسٹرار کے نام محمد علی جناح کی درخواست ہے جس میں بحیثیت وکیل عدالت میں داخلہ کی اجازت طلب کی گئی ہے۔ چودھواں، ڈاویس آف مانچسٹر کے چانسلر پی وی اسمتھ کی طرف سے جاری کردہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ ہے اور پندرھواں، بمبئی سول لسٹ کے ایک صفحہ کا عکس ہے جس سے ان کے بحیثیت وکیل رجسٹریشن کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یہاں تاسف کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ بارھویں اور چودھویں دستاویز کے گمشدہ حصے ہماری کوششوں کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ سوائے ابتدائی پانچ دستاویزات کے باقی تمام دستاویزات پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ دستاویزات جہاں محققین کے لیے معاون ثابت ہوں گی وہاں ان سے قائداعظم کے زمانۂ طالب علمی اور ابتدائی پیشہ وارانہ زندگی کے بارے میں فاطمہ جناح کی فراہم کردہ معلومات کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس کتاب میں شامل بیشتر تصاویر میرے مرحوم دوست جمیل الدین احمد کے ذخیرۂ تصاویر سے حاصل کی گئی ہیں جن کے آج ہم سب جو قائداعظم اور تحریک پاکستان پر خصوصی تفوق رکھتے ہیں، اس بناء پر احسان مند ہیں کہ انہوں نے موجودہ صدی کے چوتھے عشرے کے وسط سے مذکورہ دونوں مضامین پر قابل ذکر کام کیا تھا۔ میں ان کی بیوہ کا بھی بہت شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنے مرحوم شوہر کے ذخیرۂ تصاویر قائداعظم اکادمی کو عطیہ کر دیا ہے۔

پیش نظر اردو ترجمہ خواجہ رضی حیدر کی کاوش کا مرہون منت ہے۔ یہ امر لائق تحسین ہے کہ خواجہ رضی حیدر نے اردو ترجمہ میں اصل مسودہ کے لب ولہجہ اور بیان کی تاثیر کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور یہ ترجمہ اس طرح ایک تخلیقی عنصر سے بھی بہرہ ور ہو گیا ہے۔ اس مضمون میں ''مائی برادر'' کے پہلے باب کا ترجمہ شامل ہے جس میں بڑی حد تک غیر مطبوعہ مواد شامل ہے۔

باب اول

قوم یتیم ہوگئی

میں جب کراچی میں اس مزار کو خشت بہ خشت بلند ہوتے دیکھتی ہوں جو میرے بھائی کی باقیات فانی پر سایہ فگن ہو رہا ہے تو میرے ذہن میں ہفتہ ۱۱، ستمبر ۱۹۴۸ء کے اس دن کی اذیت ناک یادیں غول در غول وارد ہونے لگتی ہیں جب میں اپنے بھائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی تھی اور میری قوم یتیم ہوگئی تھی۔ میں چونکہ چالیس سال تک اپنے بھائی کی شریک سفر رہی تھی اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی زندگی کو اسی طرح پیش کروں جیسا کہ میں نے دیکھا تھا۔[1] چنانچہ اس ذہنی کاوش میں مصروف ہونے سے قبل میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آج صبح میں ان کی قبر پر جاؤں، فاتحہ پڑھوں، عقیدت کے چند پھول چڑھاؤں، اور محبت کے چند آنسو نچھاور کروں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو جو بہت پیارے ہوتے ہیں، جنہیں چاہا جاتا ہے اور جو مرکز محبت ہوتے ہیں اور پھر وہ جدا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملتے ہیں تو ایسے پیاروں کو بھلا اس کے سوا کوئی اور دے بھی کیا سکتا ہے۔ وہ، میرے پیارے بھائی اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور اس کتاب کے صفحات دراصل ان کی زندگی، ان کے کارناموں، جد و جہد سے عبارت ان کے مہ و سال، ان کی ناکامیوں اور محرومیوں کے ایام، کامیابیوں اور کامرانیوں کے لمحات کے علاوہ اس نصب العین، فلسفہ اور نظریہ کو پیش کرنے کی ایک کوشش ہیں، جو ان کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھے۔

قدرت نے انہیں کسی جن جیسی قوت و طاقت سے نوازا تھا، کم از کم اپنے پیش نظر کام کی تکمیل کے لیے وہ ایسی ہی مافوق الفطرت، طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرتے، تاہم قدرت نے اس قوت اور طاقت کو ایک ایسے نحیف و نزار قالب کا لباس عطا کیا تھا جو ان کے مضطرب و بے قرار ذہن اور امنگوں کی قوت محرکہ کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہ نحیف و نزار جسم خرابیٔ صحت کا مارا ہوا تھا اور جو بے پناہ مشکلات سے ستیزہ کار ایک طوفان خیز زندگی کے جوکھم اور گرم و سرد کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی قدرت نے انہیں تمام مشکلات پر حاوی آنے اور اپنے عوام کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرنے کا عزم بالجزم سے بھی نوازا تھا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں ان کی زندگی کے آخری دس برس کے دوران جب ضعیف العمری نے دستک دینی شروع کر دی تھی، بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اپنے ڈاکٹروں کے مشوروں اور اپنی چھوٹی بہن کی التجاؤں اور منتوں کے باوجود انہوں نے خود سے کوئی رعایت نہ کی اور ہمیشہ آرام اور سیر و تفریح سے گریزاں رہے۔

کام، کام ۔۔۔ اور زیادہ سے زیادہ کام بس یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ انہوں نے فطرت کے ایک فضول خرچ یا فیاض بچے کی مانند اپنی توانائی کے آخری ذرے کو بھی بے دریغ خرچ کر دیا۔ ان کی خرابی صحت سے گھبرا کر اور خوفزدہ ہو کر جب بھی کبھی میں نے ان سے اتنی زیادہ دیر تک کام نہ کرنے اور کچھ عرصے کے لیے اپنے مسلسل اور طوفانی دوروں کو ترک کرنے کی درخواست کی جن کی بنا پر وہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے رہتے تھے تو انہوں نے یہی جواب دیا:

کیا تم نے کبھی کسی جرنیل کو اس وقت رخصت پر جاتے دیکھا ہے جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقاء کے لیے مصروف پیکار ہو؟

ان کے بارے میں مشہور تھا اور یہی بات ان کی وجہ شہرت بھی تھی کہ وہ مضبوط سے مضبوط مقدمے کو ایک ہی فقرے سے تہس نہس کر دیتے تھے۔ پھر دلائل اور براہین کے معاملہ میں تو ان کے مقابلے میں مری حیثیت ہی کیا تھی۔ ایسے موقعوں پر میں منطق اور دلائل کو چھوڑ کر جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہتی ''لیکن آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے اس لیے آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے''۔

تب کہیں ان کی آنکھیں جیسے دور کہیں گھورنے لگتیں اور وہ خوابناک لہجے میں کہتے ''یہ ایک فرد کی صحت کا معاملہ نہیں، مجھے تو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی زندگی کی فکر ہے۔ جانتی ہو اس وقت کیا چیز داؤ پر لگی ہوئی ہے''۔

ان کا یہ جواب جذباتیت کو خاموش کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ غرض اپنی صحت کو قطعی طور پر فراموش کر کے وہ سیاسی جدوجہد کے طوفانی سمندر میں زیادہ گہرے اترتے چلے گئے۔

فروری ۱۹۳۷ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت پورے ہندوستان میں عام انتخابات ہو رہے تھے تو مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ اس وقت تک لیگ نہ تو پوری طرح منظم تھی اور نہ ہی اس کا پیغام پوری طرح مسلم عوام تک پہنچ پایا تھا۔ ایسی صورت حال میں مسلم لیگ کی تمام تنظیمی ذمہ داریاں اور رائے عامہ کو لیگ کے حق میں ہموار کرنے کا بوجھ ان ہی کے کاندھوں پر آ پڑا۔ ان کے دوروں کی تعداد اور طوالت میں اضافہ ہو گیا۔ ساتھ ہی عوامی جلسوں سے ان کے خطاب کی تعداد بھی بڑھ گئی اور اسی مناسبت سے وہ زیادہ سے زیادہ عدیم الفرصت ہوتے چلے گئے۔ ان کے پاس اس قسم کی درخواستوں کا سیلاب آ گیا جن میں ان سے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرنے کی درخواست کی جاتی تھی۔ ان درخواستوں کا لب لباب یہی ہوتا کہ ان کے دوروں سے لیگ کا پیغام زیادہ سے زیادہ مسلم عوام تک پہنچ سکے گا، ان مسلمانوں تک جو بتدریج بیدار اور اس حقیقت سے بہرہ ور ہوتے جا رہے تھے کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوں گے ان کا سیاسی مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا۔

وہ جہاں کہیں بھی جاتے میں ان کے ساتھ ہوتی اور یہ دیکھ کر بڑی تقویت سی محسوس ہوتی کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو رہے تھے اور ان کی تقریریں سننے کے لیے جلسوں میں آنے والے لوگوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ جہاں اس امر کا غماز تھا کہ مسلم لیگ کا اثر ورسوخ عوام کے ذہنوں پر بڑھتا جا رہا تھا وہاں خود ان کی روز افزوں ذاتی مقبولیت کا بھی ثبوت تھا۔ جب وہ اس زبردست طاقت کا تذکرہ کرتے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں مرتکز اور مجتمع تھی اور جو ان کے اتحاد کی بدولت مستقبل میں سیاسی اصلاحات کی کسی بھی اسکیم کے خدوخال متعین کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی تھی تو فضا دیر تک زوردار تالیوں سے گونجتی رہتی۔ جوش وجذبہ سے معمور رہنما کی طرح ان کی آواز گونجتی اور وہ کہتے۔ ''ہر شخص اس حقیقت کو اچھی طرح جان لے کہ مسلم لیگ برقرار رہنے کے لیے قائم ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو سبوتاژ کرنے کی تمام کوششیں بالآخر ناکام ہو کر رہیں گی۔ مسلمان آگے بڑھ رہے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے عزم کامیابی کو دبا نہیں سکتی''۔ پھر جب وہ اپنی تقریر امید ورجا سے معمور بلند آہنگی کے ساتھ ختم کرتے تو لوگوں کا عظیم الشان اجتماع ''مسلم لیگ زندہ باد'' ''محمد علی جناح۔۔زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے بلند کرنے لگتا۔

لیگ نے ۱۹۴۰ء کے لاہور اجلاس میں جس دن وہ قرارداد منظور کی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی، اسی دن سے انہوں نے روز افزوں ہر کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی بگڑتی ہوئی صحت کو مہمیز دی۔ منتشر اور غیر منظم مقلدین اور پیروکار ہی ان کی واحد قوت تھے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سال کے بعد وہ مطالبۂ پاکستان کو شرمندۂ تعبیر کر کے اسے تاریخ انسانی کا درخشاں باب بنا کر رہیں گے۔

آئے دن کے دورے اور سفر کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ، کئی کئی گھنٹے کا طویل اور تھکا دینے والے اوقات کار اور نت نئی پریشانیاں۔۔یہی وہ رخت سفر اور صلہ ہے جو کسی رہنما کو جدوجہد کے ایام میں ملتا ہے۔ یہ تمام مصروفیات ان سے بہت کچھ چھین رہی تھیں، لیکن انہوں نے یہ سب کچھ مسکراتے ہوئے بخوشی برداشت کیا۔ ان کی ۵ فٹ ۲ ۱/۲ انچ ۲ کی کاٹھی جس کا وزن عموماً ۱۱۲ پونڈ کے قریب تھا قطرہ قطرہ اونس اونس اپنی توانائی اور وزن کھو رہی تھی لیکن انہوں نے قومی فریضہ کے مقابلے میں صحت جیسے نجی معاملات کی طرف سے انتہائی اغماض اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ کسی چیز کو اپنے کام میں حائل اور حارج نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اپنی صحت کی طرف سے یہ بے پروائی دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ان سے الجھ رہی تھی ان کی منتیں سماجتیں کر رہی تھی کہ وہ کم از کم کسی اچھے ڈاکٹر کو تو دکھا دیں اور اپنی صحت کی طرف تھوڑی بہت تو توجہ دیں لیکن میری یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ میں ان کے عزم جواں کے اس مواج سمندر کے تیز وتند ریلے کو روکنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جو ان کے عوام کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو بہا لے جانے کے درپے رہتا تھا۔

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے علاوہ انہیں مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ کے قائد کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ اگرچہ قائد کئی دن سے بخار اور حرارت میں مبتلا تھے لیکن پھر بھی یہ علالت ان کے عزم سفر میں حائل نہ ہو سکی۔ ہم اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ وہ رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے چم چم کرتے ستاروں سے مزین صاف و شفاف آسمان تلے تیزی سے اپنی منزل کی سمت رواں تھی۔ وہ سونے کے لیے بستر میں لیٹے ہوئے تھے اچانک ان کے منہ سے زوردار چیخ بلند ہوئی جیسے گرم آہنی سلاخ سے ان کا جسم چھید دیا گیا ہو میں گھبرا کر اٹھی اور ان کے پاس پہنچی۔ ان سے چیخنے کا سبب معلوم کیا مگر درد اتنی شدت کا تھا کہ ان کی قوت گویائی بھی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے البتہ انہوں نے انگلی سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے اور اس کے دائیں طرف اس مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ درد ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ٹرین پوری رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں طبی امداد بھی حاصل نہ کی جا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ شاید ان کے درد میں کچھ کمی ہو، میں نے ان کے جسم کے اس حصے کی مالش شروع کی جہاں وہ تکلیف محسوس کر رہے تھے لیکن مالش سے ان کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ اب میرے ہونٹوں پر یہی دعا تھی کہ جلد کوئی اسٹیشن آ جائے، ٹرین وہاں ٹھہرے اور میں ان کے جسم کی سینکائی کے لیے گرم پانی کی بوتل ہی کا انتظام کر سکوں۔ وقت بوجھل قدموں سے گزرتا رہا۔ پھر میں نے بریک لگنے کی پرشور آوازیں سنیں بالآخر ٹرین رک گئی۔ میں نے گارڈ کو بلا کر اسے صورت حال بتائی اور اسے گرم پانی کی بوتل فراہم کرنے کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ گرم پانی کی بوتل آ گئی اور میں نے اسے نیپکن میں لپیٹ کر آہستگی سے ان کے جسم کے متاثرہ حصے پر رکھا پھر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس عمل سے درد کی شدت میں قدرے کمی آ گئی تھی۔

ٹرین علی الصبح دہلی اسٹیشن پر رکی اور جلد ہی ہم اپنی رہائش گاہ ۱۰۔ اورنگزیب روڈ پہنچ گئے۔ میں نے اپنے بھائی کو سہارا دے کر کار سے اتارا اور انہیں بستر تک لے گئی پھر فوراً ہی ان کے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا کہ وہ آ کر ان کا معائنہ کرے۔ تفصیلی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے فیصلہ سنایا کہ ان پر پھیپھڑوں کی سوزش pleurisy کا حملہ ہوا تھا اسی لیے انہیں کم از کم پندرہ دن آرام کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی انہوں نے گویا ڈاکٹر کے فیصلے کو ساقط کرنے کے لیے مجھ سے کہا۔ ''کیا بدقسمتی ہے۔ یہ انتہائی اہم اجلاس ہے اس میں میری شرکت از حد ضروری ہے اور میں زبردستی صاحب فراش کر دیا گیا ہوں اور آرام فرمانے کی عیاشی کر رہا ہوں''۔ انہوں نے جو فیصلہ سنایا تھا وہی کیا۔ دو دن تو کسی نہ کسی طور انہوں نے آرام کیا اور اس کے بعد پھر کام میں جٹ گئے۔ خدا نے انہیں ایک بے چین اور مضطرب روح عطا کی تھی اور

اس سیمابی روح نے اپنی قوم کی تاریخ کے ایک نہایت پرفتن طوفانی دور میں جنم لیا تھا۔

سنٹرل اسمبلی کا یہ اجلاس واقعی نہایت یادگار اور تاریخی تھا۔ اس اجلاس میں دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت کے بارے میں مسلم لیگ کے مؤقف کی صراحت اور وضاحت کرنے کا بوجھ بھی انہی کے شانوں پر تھا اور وہ دن بھی آیا جب انہیں اسمبلی سے خطاب کرنا تھا۔ میں ممتاز مہمانوں کی گیلری میں بیٹھی تھی اور میری نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے انہیں تقریر کے لیے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔[3] اس وقت میرے دل کو عجیب اندیشوں اور سوالات نے گھیر لیا کہ اگر انہوں نے اپنی تمام قوت مجسم کر بھی لی تو کیا وہ چند منٹ سے زیادہ بول پائیں گے؟ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ایسی گونجدار آواز میں کیا جس سے نہ ان کی تھکن کا پتہ چلتا تھا نہ ان کی بیماری کا۔ پھر جوں جوں وہ دلائل دیتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، تکان اور نقاہت کے تمام آثار ختم ہوتے گئے اور وہ جلد ہی اپنے اصل روپ میں آ گئے۔ اسلامیان ہند کی تضحیک وتذلیل کی خاطر کیے جانے والے گھناؤنے پروپیگنڈے کا مضحکہ اڑاتے ہوئے اور حکومت کو اس سلسلے میں موردالزام ٹھہراتے ہوئے انہوں نے کہا:

> بلاشبہ پروپیگنڈے کے ذریعے تم لوگ بہت کچھ کر سکتے ہو، لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو خوف و دہشت پھیلا کر بھی تم حاصل نہیں کر سکتے۔[4] کمزور فریق کو تلقین کرنا اب ایک فیشن بن گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاید ہم اس رسد کے حق میں ووٹ نہ دے سکیں جس کو استعمال کرنے میں نہ تو ہمارا کوئی ہاتھ ہو، نہ حصہ ہو اور نہ کنٹرول''۔[5] انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھی:
>
> اگر کانگریس حکومت کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئی تو اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ غلطی اگر ہوگی یا ہے تو تمہارے آئین کی ہے اور یہ آئین تم نے نافذ کیا ہے۔ تم ہی اس کو برقرار رکھے ہوئے ہو۔ یہ بے جان، از کار رفتہ دقیانوسی حکومت تم برسوں سے اس کو چلا رہے ہو۔ اب تم اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں لے سکتے۔ یہ آئین تمہارا ہے۔ تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔[6] میں اس ایوان میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ کانگریسی رہنماؤں سے معذرت کے ساتھ کہ کانگریسی لیڈر خواہ کچھ ہی دعویٰ کیوں نہ کریں گ کانگریس درحقیقت ایک ہندو تنظیم ہے۔ اور یہ کہ ہندو لیڈروں اور کانگریسی لیڈروں کے ذہن کے پچھلے گوشوں میں ہمیشہ یہ بات موجود رہی ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس اور ہندو راج کے حلقۂ اثر میں آنا چاہیے۔ یہ کہ وہ اقلیت ہیں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ صرف اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جائز طور پر اصرار کر سکتے ہیں لیکن میں کانگریس کے

حضرات اور نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے اراکین پر یہ بات قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں مسلمانوں کے اذہان میں ہمیشہ سے یہ بنیاد راسخ رہی ہے اور اس میں گزشتہ ۲۵ برسوں کے دوران کبھی سرمو فرق نہیں آیا کہ وہ اپنا ایک جداگانہ تشخص رکھتے ہیں''۷

اس پر مسٹر ایم ایس اینی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا:

۱۹۲۰ء سے قبل مسٹر جناح کا یہ نظریہ نہ تھا''

اس پر قائداعظم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

۱۹۱۶ء سے میثاق لکھنؤ کی منظوری کے بعد سے جو دو مختلف تشخص کے بنیادی اصولوں پر منظور ہوا تھا''۔

مسٹر اینی اس پر مطمئن نہ ہوئے اور انہوں بڑے طیش میں کہا''میں خود وہاں موجود تھا''۔

قائداعظم اطمینان سے کھڑے ہوئے اور انہوں نے نہایت اطمینان سے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا:

''ممکن ہے میرے دوست وہاں موجود رہے ہوں، لیکن اس وقت ان سے کوئی واقف نہیں تھا''۸

یہ جملہ نہایت تباہ کن تھا اور اس ایک جملے نے مسٹر اینی کو جو سخت طیش میں تھے مہر بہ لب کر دیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کھڑے بولتے رہے۔ میں ان کی صحت کی طرف سے فکر مند تھی کیونکہ ان کی صحت ہرگز اطمینان بخش نہ تھی۔ خوش قسمتی سے انہوں نے جلد ہی یہ کہتے ہوئے اپنی تقریر ختم کر دی:

بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی تقریر کے دوران صرف دو باتوں پر زور دیا ہے جمہوریت، جمہوریت جمہوریت اور ایک قومی حکومت! آخر اس کا فائدہ؟ کابینہ خواہ کیسی کیوں نہ ہو بہر حال اس مجلس قانون ساز کو جواب دہ ہوگی جس کے اراکین کی دو تہائی اکثریت مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاتھ میں ہے۔ میرے نزدیک تو وہ شخص قابل رحم ہے جو اس کابینہ میں شامل ہوگا لیکن جو کانگریس کے احکام اور ہدایات پر عمل نہ کرنے کی جسارت کرے گا''۔۹

اس روز جب ہم اپنی کار میں اسمبلی سے واپس گھر روانہ ہوئے تو ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ان کی انگلیوں میں جیسے قطعی سکت نہ رہی تھی اور وہ بمشکل سگریٹ تھامے ہوئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ تکان کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔

میرے خیال میں پلوریسی کا یہ حملہ ہی دراصل اس بیماری کا آغاز تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ اس مرض پر قابو بھی پا سکتے تھے بشرطیکہ وہ اس کی طرف مناسب توجہ دیتے، پابندئ اوقات کے ساتھ کام کرتے، اگر وہ برصغیر

کا دورہ کرتے ہوئے مسلسل آندھی اور بارش میں باہر نہ نکلتے۔ بہرحال اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے نزلے سے الرجک ہو گئے۔ اگر انہیں معمولی سا بھی زکام ہو جاتا تو پھر وہ بڑھ کر جلد ہی بخار اور کھانسی میں تبدیل ہو جاتا اور وہ کئی دن تک کرب و تکلیف میں مبتلا رہتے۔

چند ماہ بعد، بلکہ یوں کہیے کہ اپریل ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔ ہم بمبئی سے مدراس جا رہے تھے جہاں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے مدراس سیشن کی صدارت کرنا تھی۔[۱۰] ابھی ہماری ٹرین مدراس سے چند گھنٹوں کی مسافت پر تھی کہ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر ٹوائلٹ کی طرف بڑھے۔ وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک لڑکھڑا کر ٹرین کے چوبی فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ میں پریشانی کے عالم میں لپک کر ان کے پاس پہنچی۔ ''جن کیا بات ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ بڑی پھیکی مسکراہٹ تھی اور پھر انہوں نے زیر لب کہا:

''میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ بے حد نقاہت۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا، میرا سہارا لے کر اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی برتھ کی طرف بڑھے۔

خوش قسمتی سے چند منٹ بعد ہی ٹرین ایک بڑے جنکشن پر جا کر ٹھہری۔ پلیٹ فارم پر ہزاروں پرجوش مسلم لیگی اپنے رہنما کے منتظر تھے اور ''قائداعظم زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ ذرا سا کھولا اور چیخ کر کہا:

''شور نہ مچاؤ، قائد بستر پر دراز ہیں، انہیں سخت بخار ہے، اور تھکن ہے دوڑ کر ڈاکٹر کو لاؤ''۔

چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر آ پہنچا۔ اس نے قائد کا معائنہ کیا اور کہا:

''جناب آپ کو نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے لیکن معمولی نوعیت کا ہے، تشویش کی بات نہیں۔ پھر بھی آپ کو میرا مشورہ یہی ہے کہ کم از کم ایک ہفتہ تک چلنے پھرنے سے گریز کریں اور مکمل آرام کریں''۔

اب ہم مدراس میں تھے۔ ہزاروں مندوبین آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ قائد اتنے کمزور تھے کہ پہلے دن کے کھلے اجلاس سے خطاب نہ کر سکے۔ لیکن اگلے روز وہ صدارتی خطبہ دینے پر مصر تھے۔ میں نے انہیں بہت روکنا چاہا مگر بے سود۔ وہ اپنی بات پر قائم تھے مجبور ہو کر میں نے ان سے التجائیہ انداز میں کہا:

''آپ اسی پر مصر ہیں تو پھر کم از کم تقریر مختصر کیجیے گا''۔

''ہاں یہ تقریر بہت مختصر ہوگی'' انہوں نے مجھے یقین دلایا۔

پھر جب وہ مندوبین سے خطاب کرنے کے لیے اٹھے تو اس عظیم اجتماع پر مکمل سناٹا چھا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے فی البدیہہ تقریر کی، حد یہ ہے کہ ان کے پاس نوٹس بھی نہ تھے پھر بھی انہوں نے ہر نکتہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ اور خیال وفکر میں الجھاؤ کے بغیر بیان کیا۔ عام فہم انداز میں ہر نکتہ کی اس پیرائے میں وضاحت کی کہ وہ لوگ بھی جو اس عہد کے ہندوستان کی پیچیدہ وسیاسی گتھیوں سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے اس وقت کے سیاسی مسائل اور مسلم لیگ کے مؤقف کو آسانی سے سمجھ گئے۔ اس موقع پر وہ ایک ایسے رہنما کے انداز وآہنگ میں محو کلام تھے جو نہ صرف اپنے ذہن ہی سے بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات واحساسات سے بھی کما حقہ آگاہ ہو۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے مختصر تقریر کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ان کی یہ تقریر ہرگز بھی مختصر نہ تھی۔ وہ دو گھنٹے تک عظیم اجتماع سے مخاطب رہے۔[11] یہ وہ رہنما تھا جو اپنی بیماری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بستر علالت سے اٹھ کر اپنے عوام کے درمیان آیا تھا اور پھر اس نے نہایت جرأت کے ساتھ اسلامیان ہند کی منزل کی نشاندہی کی تھی۔ قائد نے کہا:

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں اور جس حد تک ممکن ہے نہایت واضح الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے لیے جو منزل متعین کی ہے وہ یہ ہے، ہم ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقوں میں مکمل طور پر ایسی آزاد ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں جن کے پاس دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کسٹمز، کرنسی، ایکس چینج وغیرہ کا مکمل اختیار ہو وہ ان پر مکمل کنٹرول رکھتی ہوں۔ ہم کسی صورت میں کل ہند نوعیت کا ایسا آئین نہیں چاہتے جس میں ایک مرکزی حکومت کی گنجائش رکھی گئی ہو۔ ہم کسی صورت میں اس کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہوں گے۔ یاد رکھیے، اور میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم ایک مرتبہ ایسے آئین کو قبول کرنے پر راضی ہو گئے تو مسلمانوں کا وجود برصغیر سے مکمل طور پر ختم ہو جائے گا۔ جہاں تک ہمارے آزاد قومی وطن کا تعلق ہے ہم ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں کے سلسلے میں کسی مرکزی حکومت یا طاقت کے طفیلی بن کر نہیں رہیں گے''۔

اگرچہ اس موقع پر خرابی صحت کے باوجود انہوں نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا میں اس پر بے حد فخر محسوس کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی میرے دل پر ان کی صحت کی طرف سے خوف اور تشویش کے خوفناک سائے بھی لرزاں تھے۔ بہرحال اس عظیم الشان اجتماع کا بے پناہ جوش وخروش ان کے نحیف ونزار اور علیل جسم کے لیے طاقتور ٹانک کا انجکشن ثابت ہوا اور پھر وہ اپنی کمزوری، نقاہت اور بخار کو یکسر فراموش کر کے خوشی خوشی اور پوری دلجمعی کے ساتھ کام کے ہجوم میں کھو گئے۔

قیام کے پاکستان سے پہلے سات برس، ان کی زندگی کے مصروف ترین اور انتہائی طوفان خیز ایام تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے اسلامیان ہند کے لیے انتھک اور مسلسل جدوجہد کی اور اسلامیان ہند نے بھی پوری وفاداری اور خلوص کے ساتھ ان کی بھرپور حمایت کی۔ اپنی بے جا محبت اور عقیدت کے اظہار کے لیے مسلم عوام نے انہیں قائداعظم کا لقب دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اب اس ذمہ داری کا احساس زیادہ شدید ہو گیا تھا جو اسلامیان ہند کی نجات کے لیے کی جانیوالی جدوجہد میں انہیں اپنے کردار کے اعتبار سے ادا کرنا تھی۔ میرے لیے، کہ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی، یہ روزمرہ کا نظارہ تھا کہ وہ بمشکل اپنے بستر علالت سے اٹھتے، اس کے باوجود کہ ان کے جسم پر نہایت شاندار لباس ہوتا ان کے چہرے سے کمزوری، نقاہت اور تکان عیاں ہوتی۔ ہم اپنی کار میں بیٹھے مسلمانوں کے کسی نہ کسی عظیم اجتماع سے خطاب کے لیے جا رہے ہوتے۔ تمام راستے وہ بالکل خاموش رہتے اس خاموشی کا مقصد غور وفکر نہ ہوتا بلکہ یہ خاموشی توانائی کے ہر قطرے اور ذرے کو محفوظ کرنے کے لیے ہوتی اور پھر جب وہ اپنے مداحوں اور پیروکاروں کی صفوں میں داخل ہوتے، تو ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوتی۔ لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ مخصوص انداز میں قدرے ادھر ادھر جھکتے، سلام کرتے اور اپنی پارٹی کے لوگوں کے بلند آہنگ نعرہ ہائے تحسین کا جواب دیتے۔ ان کے قدموں میں ثبات ہوتا، لڑکھڑاہٹ نام کو نہ ہوتی، آنکھیں امید کی جوت سے روشن ہوتیں پھر وہ ڈائس پر چڑھتے، آیات قرآنی کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقریروں کے بعد وہ اپنی نشست سے اٹھتے اور مائک کی طرف بڑھتے۔ ایک نظر انسانوں کے اس جم غفیر کا جائزہ لیتے جو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ان کی تقریر سننے کے لیے زمین پر بیٹھا ہوتا۔ تب ان کی آواز ابھرتی، وہ ایسے لہجے اور ایسے آہنگ میں خطاب کرتے جس میں ضعیفی یا بیماری کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ تقریر کے دوران وہ جب بھی ٹھہرتے، لوگ ''قائداعظم زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے۔ ان کی آواز امید ورجا کی کیفیت سے مملو ہو کر بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی اور ان کے عوام کا جوش وخروش بڑھتا جاتا۔ اور ان کے عوام جو کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھے ان کی تقریر سن رہے ہوتے انہیں گویا یوں محسوس ہوتا کہ وہ جیسے دھوپ میں نہیں خنک اور جان بخش سائے میں بیٹھے ہوں۔ لوگوں کو یہ احساس تک نہ ہوتا کہ ان کا قائد کتنا تھکا ہوا ہے۔ اس پر کتنی نقاہت اور کمزوری طاری ہے اور وہ کتنا بیمار ہے۔ وہ مسلم عوام کے ہیرو تھے اور ہیرو جیسی شان اور جلال کا مظاہرہ کرنے پر کسی بھی ہیرو کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

گھر واپس آ کر وہ اپنے کمرے کے محفوظ و پرسکون گوشۂ عافیت میں اپنے بستر پر بے سدھ اور نڈھال لیٹ جاتے۔ وہ تھکن سے بے حال ہوتے، سانس لینا ان کے لیے دوبھر ہوتا۔ تاریخ کی بہت سی جلیل القدر ہستیوں کی طرح گھر پر وہ عزلت نشین ہوتے لیکن ان کے وجود سے پھوٹنے والی حدت اور آگ، دور رہتے ہوئی بھی ان کے عوام کے

دلوں کو گرماتی رہتی۔ خوش قسمتی سے ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہتے محوِ خواب ہو جاتے اور یوں دن بھر کی پریشانیاں جو اگرچہ گہری نیند کی گرمی اور حدت سے پورے طور پر پگھل نہ پاتیں تاہم اس دوران تمام پریشانیاں اور پریشان کن مسائل ان کے تحت الشعور کے کنارے کنارے دست بستہ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔

پھر نئی صبح ہوتی، نئے خطوط آتے، نئی درخواستیں موصول ہوتیں، نئے مسائل ہوتے اور نئے اور اہم فیصلے کرنے ہوتے، ان کا نحیف و نزار جسم انتھک محنت اور خرابیٔ صحت سے بے حال تھا اور اس جسم میں ہر لحہ خدمت کے لیے تڑپنے والی روح جاری و ساری تھی۔ ہر چند کہ اکثر و بیشتر ان کے کمزور جسم پر بخار اور حرارت کا حملہ ہوتا رہتا پھر بھی انہوں نے برسوں تک اپنی رندگی کا یہی ہیجان خیز انداز برقرار رکھا۔

مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا گیا اور ۱۴۔۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔ جس وقت ہم، کراچی کی سڑکوں پر موجود جوش مسرت اور انبساط سے نعرے لگاتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے تو ان مشتاقان دید کو اس بات کا قطعی کوئی علم نہ تھا کہ ان کے عظیم و محبوب رہنما اور قائداعظم کتنے بیمار ہیں۔ ان کی قوم کے لیے تو یہ یوم آزادی تھا اور خود قائداعظم کی عمر بھر کی جدوجہد کا حاصل تھا، تکمیل و کامیابی کا لمحہ تھا۔ ہر چند کہ قافلہ شوق منزل پر آ گیا تھا لیکن سفر ابھی تمام نہ ہوا تھا۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر ابھرنے والی نئی مملکت کو نہایت زبردست اور بے شمار مسائل کا سامنا تھا اور سربراہ مملکت کی حیثیت سے پاکستان کے مستقبل کی کشتی کو محفوظ و مامون ساحل پر پہنچانے اور لنگر انداز کرنے کی ذمہ داری ان شانوں پر تھی جو انتھک کام سے پہلے ہی شل تھے۔

رنج اور دکھ کے احساسات دل میں لیے میں یہ دیکھتی رہی کہ کامیابی و کامرانی کے اس مرحلہ پر قائداعظم جسمانی طور پر پوری طرح چاق و چوبند اور صحت یاب نہ تھے۔ ان کی بھوک مر چکی تھی، بہترین سے بہترین اور لذیز کھانے جو نہایت محبت اور توجہ سے تیار کیے جاتے وہ بھی انہیں اپنی طرف راغب نہ کرتے۔ اپنی مرضی کے مطابق کسی وقت بھی سو جانے کی ان کی دیرینہ عادت بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کی کئی کئی راتیں بیداری کے عالم میں گزر جاتیں۔ وہ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ تکیہ پر سر ادھر ادھر کرتے اور کروٹیں بدلتے رہتے۔ کھانسی کے ساتھ ہی انہیں حرارت بھی رہنے لگی تھی اور پھر پاکستان کی سرحدوں کے پار سے مسلمانوں کے قتل عام آتشزنی، لوٹ مار اور عصمت دری کی دلخراش خبروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے ان کے حساس ذہن کو اور بھی زیادہ متاثر کیا۔

ناشتہ کی میز پر جب وہ قتل عام کی ان خبروں پر مجھ سے تبادلۂ خیال رکتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتیں۔ پھر ہندوستان سے ارض موعودہ یعنی پاکستان آنے والے لٹے پٹے مسلم مہاجرین کے مصائب اور مشکلات بھی ان کے لیے سوہان روح تھیں۔ ان مسائل کے علاوہ پاکستان کے آئین کی تیاری اور تشکیل کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔

جب کبھی انہیں موقع ملتا وہ اس اہم قومی کام کے سلسلے میں اپنے کتب خانے میں دنیا کے مختلف ممالک کے دساتیر سے متعلق کتابوں سے گھرے ہوئے ماحول میں بیٹھ کر غور وخوض کرتے ان کے علاوہ کشمیری مسلمانوں کا مسئلہ بھی ان کی ذہنی پریشانی کا سبب تھا جنہیں ایک ظالم وجابر اور اجنبی حکمران نے فریب دیا تھا۔ اگرچہ پاکستان نے دنیا کے نقشے پر اپنی جگہ بنالی تھی لیکن اسے ابھی اپنی سرزمین میں جڑیں پکڑنا تھیں یہ وہ مسائل تھے جن کے بارے میں وہ صبح، دوپہر، شام، غرض ہر وقت گفتگو کرتے رہتے۔ مسائل کے یہ وہ عفریت تھے جنہوں نے ان کا ذہنی سکون تباہ کر دیا تھا۔

ہمارے کراچی پہنچنے کے چند دن بعد ہی کراچی کلب میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا:

> مس جناح میرے لیے مدد اور حوصلہ افزائی کا ایک سرچشمہ ہیں۔ ان دنوں جب میں یہ توقع کر رہا تھا کہ برطانوی حکومت مجھے قید کر لے گی، جب کہ انقلاب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا تھا، میری بہن ہی کی ذات تھی جس نے میری ہمت افزائی کی اور اس وقت انہوں نے مجھ سے حوصلہ افزا کلمات کہے۔ میری صحت کی دیکھ بھال ان کی مستقل ذمہ داری ہے۔[۱۳]

اس وقت بھی جب کہ قائد یہ الفاظ کہہ رہے تھے ان کے سامعین کو اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ ان کے رہنما کی صحت کتنی خراب ہے۔

یہ ایک قول صادق ہے کہ جدوجہد کرنے والے عظیم لوگوں کے وجدان کے لیے مکمل ناکامی کے مقابلے میں مکمل کامیابی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنا مقصد حیات حاصل کر چکے تھے اور قدرت نے انہیں مکمل کامیابی کے انعام سے نوازا تھا اس کے باوجود نہ تو ان کا جوش وجذبہ ماند پڑا تھا نہ اپنے عوام کی خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے حوصلہ میں کوئی کمی آئی تھی۔ خرابیٔ صحت کے مہیب دیو نے ان کی جسمانی طاقت وتوانائی چوس لی تھی، لیکن ان کی ناقابل تسخیر روح اب بھی سپر انداختہ نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ سینہ تانے اور سر اٹھائے اس چیلنج کو بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ تھے جو آزادی کے بعد ان کی قوم کو درپیش تھا وہ ان مسائل اور چیلنجوں سے جرأت مندانہ انداز میں نمٹنا اور عہدہ برآء ہونا چاہتے تھے اور ان کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔

اپنی صحت کو انہوں نے قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کی کھانسی اور مسلسل حرارت میرے لیے مستقل پریشانی کا باعث تھی۔ میرے بے حد اصرار پر وہ بمشکل اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر کرنل رحمٰن سے معائنہ کرانے پر رضامند ہو گئے۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹروں اور دواؤں سے وہ ہمیشہ ہی سے غیر معمولی طور پر گریز کرتے رہتے تھے، اور میں تمام کوشش کے باوجود اس عادت کا سبب معلوم کرنے میں ناکام رہی۔ ڈاکٹر کرنل رحمٰن نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ انہیں معمولی

نوعیت کا ملیریا ہے اور وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ان کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ اس پر قائد نے اپنے ڈاکٹر سے متعدد سوالات کئے، سوالات کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کمرۂ عدالت میں کسی گواہ پر جرح کر رہے ہوں، ڈاکٹر کی وضاحت سے وہ مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں استعمال کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

''مجھے ملیریا نہیں ہے، میں کام کی زیادتی کی وجہ سے نڈھال ہوں''

ظاہر ہے ایسی حالت میں آرام ہی سب سے بہترین دوا تھی، لیکن کام اس قدر زیادہ تھا کہ وہ آرام نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا:

> میں اپنی جسمانی طاقت اور توانائی کے ذخیرے کو اس وقت تک استعمال کرتا رہوں گا جب تک اس میں عوام کی خدمت کے لیے توانائی کا آخری قطرہ موجود ہے اور جب وہ آخری قطرہ بھی صرف ہو جائے گا تو میرا کام اختتام کو پہنچے گا کیونکہ پھر زندگی ہی نہ ہوگی۔
>
> کھوکھراپار کی سرحد سے پاکستان میں مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔[۱۴]

وہ مہاجرین کیمپوں اور مہاجرین کے لیے کیے جانے والے ضروری اقدامات کا معائنہ کرنے کے لیے لاہور جانا چاہتے تھے اس مرحلے پر انہیں دو میں ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا یعنی اس کاز کے لیے جو انہیں ہمیشہ زندگی سے زیادہ عزیز رہا تھا۔ فرض کی بجا آوری یا پھر خرابیٔ صحت کے پیش نظر آرام، جس کا اثر صرف ان کی ذات پر پڑ سکتا تھا اور پھر انہوں نے بلا تامل فرض کی پکار پر لبیک کہنا پسند کیا، ڈاکٹروں کے مشوروں پر کوئی کان نہ دھرا۔ ان کے اندر چھپا ہوا فرد اپنے تمام حقوق سے اس رہنما کے سامنے دستبردار ہو گیا جو ان کی ذات میں پنہاں تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں یعنی کراچی پہنچنے کے کوئی ایک ماہ بعد ہی ہم کراچی سے لاہور کی جانب محوِ سفر تھے۔ لاہور میں چند روز قیام کے بعد ہم پھر کراچی واپس آ گئے۔ کراچی میں ہم بمشکل تین ہفتے رہے ہوں گے کہ ایک مرتبہ پھر یعنی اکتوبر کے اواخر میں ہم لاہور گئے۔ ان کے لیے قیام پاکستان جہاں ان کی زندگی بھر کے کام کے ایک مرحلے کی تکمیل تھا وہیں اتنے اہم مرحلے کی ابتدا بھی تھا۔ یہ دوسرا مرحلہ پاکستان کو مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر استوار کرنا اور اس کے استحکام کو یقینی بنانا تھا۔ اس وقت ان کی قوم ایک شدید بحران سے گزر رہی تھی اور وہ اس موقع پر اپنے مورچے سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ذات سے بھی کوئی رعایت نہ کی۔ پاکستان کے افق پر مایوسیوں کے گہرے بادل منڈلا رہے تھے اور وہ عوام کے ذہنوں سے مایوسی اور محرومی کے احساس کو زائل کر کے انہیں امید و رجا اور نئی امنگوں اور جذبوں سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں یونیورسٹی اسٹیڈیم میں ایک زبردست جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ۳۰ جون کے پلان کو منظور کر لینا مسلم لیگ کی غلطی تھی تو میں ان لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس پلان کی منظوری کے متبادل کوئی اور راہ اختیار کرنے کے نتائج اتنے زیادہ تباہ کن ہوتے کہ ان کا تصور بھی محال ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے بالکل صاف ضمیر اور نیک نیتی کے ساتھ اس منصوبے پر عملدرآمد کرنا چاہا۔ وقت اور تاریخ اس کا ثبوت دیں گے۔ دوسری جانب تاریخ ان لوگوں کے بارے میں بھی اپنا فیصلہ رقم کرے گی جن کے گٹھ جوڑ، فریب کاری اور سازشوں نے برصغیر میں انتشار اور تباہی کی قوتوں کو بے لگام کر دیا اور جس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد موت کے گھاٹ اتار دئے گئے بہت بڑے پیمانے پر املاک تباہ کی گئیں اور لاکھوں افراد کے گھر اجاڑ کر ان کو بے گھر اور بے در کر کے اور ان سے وہ سب کچھ چھین کر جو انہیں بے حد عزیز تھا انہیں آلام ومصائب میں مبتلا کر دیا۔ جس منظم انداز میں نہتے اور بے بس اور بے گناہ افراد کو قتل عام میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس پر تاریخ کے انتہائی ظالم و جابر حکمران بھی اپنے شرمناک اور قابل نفریں وملامت آمیز مظالم پر شرمسار نظر آتے ہیں۔ ہم ایک نہایت گہری اور خوب سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔ شرافت، ایمانداری، مردانگی اور عزت و وقار کے تمام بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اس سازش کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ہم خدائے رحیم وکریم کے شکر گذار ہیں کہ اس نے شر کی ان قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں حوصلہ اور ایمان عطا کیا۔ اگر ہم نے قرآن کریم سے رشد وہدایت حاصل کرنے کو اپنا شعار بنایا تو یقین رکھیے کہ آخری فتح ہماری ہوگی۔[۱۵]

جوں جوں ان کی تقریر آگے بڑھتی رہی ان کی آواز جوش جذبات سے کپکپاتی رہی۔ میں نے پہلی مرتبہ انہیں موت کے بارے میں بات کرتے سنا۔ وہ کہہ رہے تھے:

اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے حوصلے بلند رکھیں۔ موت سے ہرگز خوفزدہ نہ ہوں۔ ہمارا مذہب ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ پاکستان اور اسلام کے وقار کو بچانے کے لیے ہمیں جرأت کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی چاہئیں۔ ایک مسلمان کے لیے حق کی خاطر شہید کی موت سے بڑھ کر بہتر کوئی ذریعۂ نجات نہیں۔ اپنا فرض ادا کیجیے اور اللہ پر بھروسہ کیجیے۔ روئے زمین پر ایسی کوئی طاقت نہیں جو پاکستان کو ختم کر سکے۔ پاکستان قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔

سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ مہاجرین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا اور جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ مہاجرین پر پوری توجہ دی جا رہی ہے تو ہم کراچی واپس آ گئے۔ اپنے عوام کے آلام و مصائب کو دیکھ کر ان کے جذبات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ اس کیفیت اور اس فضا نے نہ صرف ان کے جسم کو نڈھال کر دیا بلکہ ان کو روحانی اور جذباتی طور پر بھی بے حد متاثر کیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر صاحب فراش ہو گئے۔ تھکن، نقاہت اور تیز بخار نے انہیں آ لیا۔ اسی عرصہ میں نورائیدہ ملک کی حکومت کا کام روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اس ملک نے ہر کام کا آغاز الف سے کیا تھا۔ فائلیں تھیں کہ چلی آ رہی تھیں۔ وزرا اور سیکرٹری مشورہ حاصل کرنے ان کے پاس آیا کرتے۔ ایسی صورت میں آرام و سکون ناممکن تھا۔ وہ ہفتوں کے بے پناہ کام اور آرام کے گنے چنے ایام کے درمیان ڈولتے رہتے۔ انہوں نے صوبۂ سرحد کے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ گذشتہ برس کے ریفرنڈم کے سلسلے میں، جس کے ذریعے سرحد کے عوام نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر وہ ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنے پشاور آئیں گے۔ وہ سرحد کے عوام کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس وعدے کے ایفاء کے لیے جو انہوں نے کیا تھا، ہم اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور گئے جہاں بے پناہ مصروفیتیں ان کی منتظر تھیں۔

۱۲ اپریل کو اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> اس موقع پر میرے ذہن میں اس امداد و حمایت اور تعاون کے خیالات امڈے آ رہے ہیں جو طلبہ برادری اور خاص طور پر اس صوبے کے طلبہ کی طرف سے حصول پاکستان کی تحریک کو حاصل رہی ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح احساس ہے کہ اس صوبے کے عوام نے گذشتہ سال ریفرنڈم کے ذریعہ پاکستان میں شامل ہونے کا جو واضح اور بے نقص فیصلہ کیا تھا اس میں طلبہ کے کردار کا بڑا دخل تھا۔ میں اس حقیقت پر بالخصوص فخر کرتا ہوں کہ حصول پاکستان اور آزادی کی جدوجہد میں اس صوبہ کے عوام کبھی بھی اور کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہے۔[۱۷]

اگلے روز ہم بذریعہ کار رسالپور گئے جہاں انہیں رائل پاکستان ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرنا تھا۔ بھارت نے وہ فوجی ساز و سامان روک لیا تھا جو تقسیم ہند کے وقت ہونے والی مفاہمت کے مطابق پاکستان کو ملنا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فضائیہ کے پاس نہ تو مناسب طیارے تھے اور نہ ساز و سامان چنانچہ اس موقع پر انہوں نے کہا:

> مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے پاس طیاروں اور ساز و سامان کی کمی ہے لیکن ضروری ساز و سامان حاصل کرنے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ جدید طیاروں کے لیے آرڈر دیئے جا چکے ہیں مگر یاد

رکھیے کہ طیارے اور عملہ کے افراد خواہ کتنی ہی تعداد میں کیوں نہ ہوں، وہ اس وقت تک بیکار ہیں جب تک فضائیہ میں ٹیم اسپرٹ اور نظم وضبط کا انتہائی سخت احساس نہ ہو۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف اور صرف نظم وضبط اور خود اعتمادی کے ذریعہ ہی رائل پاکستان ائیر فورس پاکستان کے شایان شان ہو سکتی ہے۔[۱۸]

۱۴ اپریل کو انہوں نے پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں سول افسروں کا اجلاس طلب کیا۔ اس موقع پر انہوں نے متعدد افسروں سے ملاقات کی وہ بے تکلفی سے ان کے ساتھ گھل مل گئے اور ان سے غیر رسمی گفتگو کرتے ہوئے کہا:

پہلی بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی سیاسی پارٹی یا کسی بھی سیاستدان یا کسی بھی سیاسی دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ اگر آپ پاکستان کی عظمت اور اس کے وقار کو دوچند کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی بھی قسم کے دباؤ سے متاثر نہیں ہونا چاہیے اس کے برعکس آپ کو مملکت اور عوام کے خادموں کی حیثیت سے بلاخوف وخطر اور پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ سول سروس ریاست کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتوں کو شکست ہوتی ہے۔ وزراء بھی آتے جاتے رہتے ہیں، لیکن آپ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ اس لیے آپ کے شانوں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سیاسی جماعت، یا اس سیاسی جماعت، اس سیاسی لیڈر یا اس سیاسی لیڈر، کی حمایت کرنے میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ آئین کے مطابق کوئی بھی حکومت قائم ہو اور عام آئینی طریق کار کے مطابق کوئی بھی وزیر اعظم یا وزیر برسر اقتدار آئے، آپ کا فرض نہ صرف پوری وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ حکومت کی خدمت کرنا ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی عزت، وقار اور ساکھ پر قائم رہتے ہوئے اپنی سروس کی ساکھ کو بھی برقرار رکھیں۔ اگر آپ اس عزم کے ساتھ اپنا کام شروع کریں گے تو یقین رکھیئے کہ پاکستان کو ہمارے تصورات اور خوابوں کیمطابق ایک شاندار مملکت اور دنیا کی عظیم قوموں میں سے ایک قوم بنانے میں آپ ایک اہم کردار ادا کریں گے۔

اس وقت جب کہ میں آپ کو ان باتوں کی تلقین کر رہا ہوں، میں اسی انداز میں اپنے لیڈروں اور سیاستدانوں کو بھی یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی صورت میں بھی آپ کے کام میں مداخلت نہ کریں، نہ آپ پر سیاسی دباؤ ڈالیں کیونکہ اس کا نتیجہ بدعنوانی، رشوت ستانی، اور اقرباء پروری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ ایک انتہائی خوفناک بیماری ہے۔ اس بیماری میں نہ صرف آپ کا صوبہ بلکہ دیگر صوبے بھی

مبتلا ہیں۔ اگر یہ لوگ اس انداز میں آپ کے کام میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ وزراء کی خواہشات کی تکمیل نہ کرنے کی وجہ سے آپ میں سے بعض کو نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ اگرچہ مجھے توقع ہے کہ ایسا نہیں ہوگا پھر بھی اس امر کا امکان ہے کہ آپ مشکلات اور پریشانیوں میں گھر جائیں گے، اس لیے نہیں کہ آپ نے کوئی غلط کام کیا ہوگا بلکہ صحیح کام کرنے کی وجہ سے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہوسکتا ہے مگر قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور میری آپ سے یہی اپیل ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو آگے بڑھ کر قربانیاں دیں، بلیک لسٹ ہونا گوارا کریں، پریشانیاں اور تکالیف برداشت کریں۔ اگر آپ نے قربانیاں دے کر مجھے موقع فراہم کیا تو آپ میں کچھ لوگ میری اس بات کا ضرور یقین کریں گے کہ ہم ان برائیوں کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے دیانتداری، خلوص اور مملکت سے وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض پورے کیے تو آپ ہرگز بھی بلیک لسٹ نہیں رہیں گے۔ یاد رکھیں کہ آپ ہی لوگ ہیں جو ہمیں ایک ایسی طاقتور مشینری قائم کرنے کا موقع دے سکتے ہیں جس سے خود آپ کو بھی تحفظ کا مکمل احساس حاصل ہوسکے گا۔ آپ کو اسی جذبے کے ساتھ کام کی ایک ایسی فضا قائم کرنی چاہیے کہ ہر شخص کو اس کا حق مل سکے اور ہر شخص کے ساتھ انصاف ہوسکے۔ یاد رکھیے کہ نہ صرف انصاف ہونا چاہیے بلکہ اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔[19]

چند دن کے بعد انہوں نے پشاور میں ایڈورڈز کالج کے طلباء سے خطاب کیا، اور اس دن کا تذکرہ کیا جب انہیں ۱۹۳۷ء میں اس صوبے سے عملی طور پر نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے ان دنوں کا تذکرہ کیا جن دنوں اس صوبے میں مسلم لیگ کو شکست ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اس تبدیلی کا حوالہ دیتے ہوئے، جو گذشتہ دو تین برس کے دوران صوبے میں آئی تھی، جرأت مند اور غیور پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا، جنہوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا اور ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی:

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے اپنے سر بلند رکھیں۔ حکومت تعریف کی مستحق ہو تو اس کی تعریف کیجیے اور جب اس کے برعکس معاملہ ہو تو اپنی حکومت پر بے خوفی سے تنقید کیجیے۔ یقیناً جب کبھی برائی یا غلطی کی جائے تو آپ بے خوف ہو کر نکتہ چینی کریں، میں نکتہ چینی اور تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اسی طریقے سے آپ معاملات کو ہمارے عوام کی بھلائی کی

خاطر جلد از جلد بہتر بنا سکتے ہیں۔[۳۰]

پشاور میں کھلے آسمان تلے ایک اجتماع میں بھی انہوں نے شرکت کی۔ اس وقت آسمان پر گہرے سیاہ بادل ہیبت ناک انداز میں چھائے ہوئے تھے۔ اجلاس کی کارروائی بڑھتی رہی۔ بوندا باندی شروع ہوگئی لیکن وہ ہزاروں افراد جو وہاں جمع ہو چکے تھے، بارش کے خوف اور خطرے سے بے نیاز اپنی نشستوں پر جمے رہے۔ میرے بھائی، ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سرگوشی میں انہیں یہ مشورہ بھی دیا کہ موسم کے پیش نظر ہمیں چل دینا چاہیے، لیکن وہ نہ مانے۔ وہ پانی میں شرابور ہو گئے لیکن وہ جلسے کی پوری کارروائی کے دوران بیٹھے رہے اور اس ناسازگار موسم کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اسی رات انہیں نزلہ، کھانسی، سردی اور بخار ہوگیا۔ ان کی ناک بہہ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر بلانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا:

''فکر نہ کرو، یہ کچھ بھی نہیں ہے، صرف نزلہ ہی تو ہے، میں اس پر قابو پالوں گا''

لیکن وہ اس پر کبھی قابو نہ پا سکے۔ جب ہم کراچی واپس آئے تب بھی انہیں کھانسی تھی اور وہ مسلسل کھانستے رہتے تھے۔ جب زبردستی ایک ڈاکٹر سے ان کا معائنہ کرایا گیا تو پتہ چلا کہ ان پر برونکائٹس کا حملہ ہوا تھا۔ اگرچہ وہ چند دن تک بستر علالت پر دراز رہے، پھر بھی جو فائلیں ان کے پاس بھیجی جاتیں وہ باقاعدگی سے انہیں دیکھتے۔

کوئی چھ ہفتے بعد ان کی حالت قدرے سنبھلی لیکن کمزوری اب بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ میں ان سے منتیں کرتی رہی کہ وہ آب وہوا کی تبدیلی کے لیے کہیں اور چلے جائیں تاکہ ان کی صحت بحال ہو سکے۔ میری ان درخواستوں اور التجاؤں کی حمایت ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر کرنل عبدالرحمٰن نے بھی کی اور صاف صاف الفاظ میں خبردار کیا کہ اگر انہوں نے کام بالکل چھوڑ کر کم از کم دو ماہ مکمل آرام نہ کیا تو وہ اپنی صحت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائیں گے۔ پھر ماہ جون کے اس دن میں نے اطمینان کا سانس لیا جب بالآخر وہ تبدیلیٔ آب وہوا پر رضامند ہو گئے اور یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں کراچی کے موسم گرما کی ناقابل برداشت گرمی سے نکل کر کوئٹہ کی خنک بلندیوں کی طرف چلنا چاہیے۔

کوئٹہ پہنچنے کے چند دن کے اندر ہی میں نے ان کی صحت میں نمایاں بہتری دیکھی۔ اب وہ خوب گہری نیند سوتے تھے۔ ان کی خوراک بڑھ گئی تھی، کھانسی کم ہوگئی تھی اور ٹمپریچر بھی معمول پر آ گیا تھا۔ صرف ایسی انتہائی اہم فائلیں ان کے پاس بھیجی جاتیں جو ان کی ذاتی توجہ کی طالب ہوتی تھیں۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ان کو قدرے طویل آرام میسر آیا تھا۔

کبھی کبھار وہ ان عوامی تقاریب میں شرکت کی دعوت قبول کر لیتے جن کا اہتمام کوئٹہ کے عوام کے مختلف طبقات کرتے تھے۔ وہ ان موقعوں پر ان اہم مسائل کے بارے میں جو اس وقت پاکستان کو درپیش تھے اپنا نقطۂ نظر

واضح کرتے۔ مثال کے طور پر کوئٹہ کی پارسی برادری کی جانب سے پیش کیے جانے والے خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

> معاملات کی نوعیت کے اعتبار سے پاکستان کا آئین تیار ہونے میں اٹھارہ ماہ سے دو سال کا عرصہ درکار ہوگا۔[۲۱]

جس وقت انہوں نے یہ الفاظ کہے تو مجھے آزادی کے بعد کے وہ کئی مواقع یاد آ گئے جب انہوں نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے آئین کی تیاری کے بارے میں فکر و تردد کا اظہار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کا نیا آئین بننا چاہیے۔ یہ نیا آئین لبرل ہوگا اور اس میں پاکستان کے عوام کی بنیادی آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہوگی۔ ساتھ ہی وہ اس توقع کا بھی اظہار کرتے کہ یہ کام وہ دو برس میں مکمل کر لیں گے۔ وہ کہا کرتے:

> یہ ایک ایسا آئین ہوگا جو ایک آزاد ملک کے آزاد عوام کے شایانِ شان ہوگا۔

یہ بات ان کے حساس ذہن کے لیے خاصی جھلاہٹ کا باعث تھی کہ آئے دن ان کی علالت کے باعث یہ اہم کام تاخیر کا شکار ہو رہا تھا۔

خطبہ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پاکستان میں آباد اقلیتوں کے مسائل کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

> آپ جانتے ہیں کہ میری اور میری حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ بلا لحاظ رنگ، نسل، مذہب و ملت، پاکستان میں آباد ہر فرقے کے ہر فرد کی جان، مال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ کیا جائے اور یہ کہ پاکستان میں امن و سکون ہو اور امن و امان ہر صورت میں برقرار رکھا جائے۔[۲۲]

اگلے دن انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے خطاب کیا اور افسروں سے نہایت گھمبیر لہجے میں کہا:

> ایک چیز اور، میں یہ بات کہنے پر اس لیے مجبور ہوا ہوں کہ اعلیٰ سطح کے دو ایک افسروں سے گفتگو کے دوران میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج کے دستے جو حلف اٹھاتے ہیں وہ اس کے مفہوم اور اہمیت سے واقف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حلف اگرچہ محض ایک رسمی بات ہے لیکن زیادہ اہم بات صحیح جذبہ اور قلبی وابستگی ہے۔
>
> لیکن یاد رکھیے کہ یہ ایک اہم رسم ہے اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے مجوزہ حلف کو پڑھ کر آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتا ہوں، خدا کو حاضر و ناظر جان کر میں عہد کرتا ہوں کہ میں پاکستان کی ڈومینین اور اس کے آئین کا وفادار رہوں گا؟ یہاں آئین اور ڈومینین آف پاکستان کے الفاظ پر غور کیجیے اور یہ کہ میں، جیسا کہ میرا فرض ہے پاکستان کی ڈومینین کی مسلح افواج میں ایمان

داری اور وفاداری کے ساتھ خدمات بجالاؤں گا اور اپنی ملازمت کی شرائط کار کے مطابق بحری، بری اور فضائی راستوں سے ہر اس جگہ جاؤنگا جہاں مجھے جانے کا حکم دیا جائے گا اور یہ کہ میں مقرر کیے جانیوالے ہر افسر کے احکام بجالاؤں گا اور ان کی پیروی کروں گا۔۔۔۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اصل اہمیت جذبے اور روح کی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو اس وقت پاکستان میں نافذ ہے اور اس کے حقیقی آئینی اور قانونی مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ جب آپ یہ کہیں کہ آپ آئین کے وفادار ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے۔[۲۳]

۱۵ جون کو کوئٹہ میونسپلٹی کی طرف سے دئے گئے استقبالیے میں شہری خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ پاکستان کے ہر گوشہ میں صوبائی عصبیت کی لعنت اپنی راہ بناتی جا رہی ہے۔ انہوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اس بات کو فراموش کر دیں کہ وہ بلوچی، پٹھان، پنجابی، سندھی یا بنگالی ہیں اور خود کو اول و آخر صرف پاکستانی سمجھیں۔ آخر میں انہوں نے کہا:

بلاشبہ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ادارے قابل قدر اور پسندیدہ چیزیں ہیں لیکن جب لوگ ان چیزوں کی بے قدری کر کے انہیں صرف ذاتی شان و شوکت کا ذریعہ بنالیں تو یہ ادارے نہ صرف اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں بلکہ اپنے لیے بدنامی بھی مول لیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس سے گریز کریں اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہم جیسا کہ میں نے کہا، اپنے اعمال کے مستقل محاسبہ کو اپنا شعار بنائیں اور انہیں ذاتی یا گروہی مفادات کی بجائے مملکت کی عام فلاح و بہبود کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ڈالیں۔[۲۴]

انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کی دعوت قبول کر لی تھی مجھے ڈر تھا کہ اگر انہوں نے اس مقصد کے لیے کراچی کا سفر کیا اور ایک دو دن بعد پھر کراچی سے واپس کوئٹہ آئے تو ہوسکتا ہے کہ ان کا مرض پھر عود کر آئے۔ اس لیے میں نے انہیں سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور تجویز پیش کی کہ بہتر یہی ہوگا کہ اس موقع پر ان کی تیار کردہ تقریر ان کی طرف سے کوئی اور پڑھ کر سنا دے۔

میری یہ بات سن کر انہوں نے کہا:

تمہیں علم ہے کہ کانگریس اور ہندوؤں نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان ایک دیوالیہ مملکت ہوگی اور یہ کہ ہمارے لوگوں کے لیے اس مملکت کی معیشت، تجارت، صنعت، بینکاری، جہاز رانی اور انشورنس وغیرہ کے شعبوں کا انتظام کرنا مشکل ہوگا۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم میں، نہ صرف سیاسی شعبے میں بلکہ مالیات اور بینکنگ کے شعبے میں بھی اپنے ملک کو چلانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس

کے چند دنوں بعد ہم واپس کوئٹہ آ جائیں گے۔ میری صحت کی فکر کیوں کرتی ہو یہ بہر حال ایک فرض ہے جو مجھے ادا کرنا ہے میں اسے ملتوی نہیں کر سکتا اور نہ میں خطرات مول لینے سے ڈرتا ہوں۔

غرض کوئٹہ اور کراچی کے درمیان اس سفر نے ان پر خاصہ برا اثر ڈالا جس دن اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح ہونے والا تھا وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ حد درجہ کمزوری کے باوجود اپنا فرض پورا کرنے کے لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ موقع کی مناسبت سے مناسب لباس زیب تن کیا، پھر منتخب افراد کے اجتماع کے سامنے اپنی تقریر کی۔ خرابیٔ صحت کے باوجود ان کی تقریر کا پہلا جملہ ہی اس تقریب میں ان کی پوری طرح موجودگی کا غماز تھا۔ انہوں نے کہا:

> اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبے میں ہماری مملکت کی خودمختاری کی علامت ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ مسٹر گورنر! کہ غیر منقسم ہندوستان میں بینکنگ پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا اور مغربی پاکستان سے ان کی نقل مکانی کے بعد ہمارے نوزائیدہ ملک کی معیشت کو خاصہ دھچکہ لگا ہے۔ صنعت وتجارت کی گاڑی کے پہیوں کو بلا رکاوٹ رواں دواں رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ غیر مسلموں کی نقل مکانی سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے بلا تاخیر پر کیا جائے۔ مصارف زندگی میں غیر معمولی اضافے سے معاشرے کا غریب طبقہ بے حد متاثر ہوا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو لگی بندھی تنخواہ پاتے ہیں۔ یہی مہنگائی بڑی حد تک ملک میں موجودہ بے چینی کا سبب بھی ہے۔ حکومت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو ایسی سطح پر مستحکم رکھا جائے جو نہ صرف صناعوں کے لیے بلکہ صارفین کے لیے بھی مناسب ہوں۔ مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دئے ہیں اور ہم میں سے بہت سوں کا خیال ہے کہ اس وقت دنیا کو جس تباہی کا سامنا ہے اس سے ایک معجزہ ہی انسانیت کو بچا سکتا ہے۔ مغرب کا یہ اقتصادی نظام افراد کے درمیان انصاف کرنے اور عالمی سطح پر آویزش کو ختم کرنے میں قطعی ناکام رہا ہے۔ مغربی دنیا اپنی میکانکی ترقی اور صنعتی کارکردگی کے فوائد کے باوجود آج جس خرابی سے دوچار ہے، تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مغرب کا اقتصادی نظریہ اور ان کے طریقۂ کار کو اپنانا ہمارے لیے سودمند نہیں ہوگا۔ ہمارا مقصد لوگوں کو خوش اور مطمئن رکھنا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل اور اپنی منزل کا تعین اپنے انداز فکر کے مطابق کرنا ہوگا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا جو مساوات انسانی اور عدل عمرانی کے اسلامی تصور پر مبنی ہو۔ اسی طرح سے ہم مسلمانوں کی حیثیت سے اپنا مشن مکمل کر سکیں گے اور انسانیت کو امن کا پیغام دے سکیں گے کیونکہ یہی پیغام امن، انسانیت کو بچا سکتا ہے اور اس کی بہبود،

ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہوسکتا ہے۔[۲۵]

مجھے یقین ہے کہ اس تقریب میں موجود ہر شخص نے اس بات کو جان لیا ہوگا کہ قائداعظم کی صحت اس وقت بے حد خراب تھی، ان کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ تقریر کا متن پڑھتے ہوئے وہ بار بار ٹھہر جاتے تھے اور بار بار کھانس رہے تھے۔ تقریب کے بعد جب ہم واپس گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو وہ اتنے نڈھال تھے کہ کپڑوں اور جوتوں سمیت ہی بستر پر لیٹ گئے۔ تاہم ضعیفی اور بیماری سے نزار اس جسم سے جو اس وقت بستر پر دراز تھا ذہانت اور نابغہ کا ایک شعلۂ مثبت روشن تھا۔

اسی روز شام کو انہوں نے امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر ایک استقبالیہ میں شرکت کی دعوت بھی قبول کر لی تھی۔ اگرچہ وہ بیمار تھے لیکن یہ بیماری انہیں اپنے سرکاری فرائض سے باز نہ رکھ سکی۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے استقبالیہ میں شرکت نے کے لیے لباس تبدیل کیا اور ہم امریکی سفیر کی پارٹی میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر ان کے رویے سے نہ تو کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا نہ تھکن کا۔ جو مہمان ان کے پاس لائے گئے انہوں نے ان سے باتیں کیں۔ ان کی خوش مزاجی نے ان کی خرابی صحت پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ایک اعلیٰ وارفع منصب پر فائز شخص کو ایسے موقعوں پر جو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے وہ انہیں نے مسکراتے ہوئے پیش کی۔

کراچی میں پانچ دن قیام کے دوران انہوں نے بعض نہایت اہم فائلوں کا مطالعہ کیا اور بعض اہم کام نمٹائے۔ پھر ہم بذریعہ طیارہ واپس کوئٹہ آ گئے۔ اگرچہ اس ہوائی سفر کو انہوں نے اچھی طرح برداشت کر لیا تاہم اگلے روز ان پر نقاہت اور تھکن کے آثار طاری ہو گئے۔ ہلکی سی حرارت بھی ہوگئی جس ان کی بے چینی اور میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ کوئٹہ میں ایک مرتبہ پھر مختلف اداروں اور بے شمار افراد اور لیڈروں کی طرف سے درخواستیں اور مطالبات کا تانتا بندھ گیا۔ وہ ان سب سے ملنا چاہتے تھے اور یہ بات ان کے لیے سوہان روح تھی کہ خرابیٔ صحت کی بنا پر وہ ان درخواستوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے کوئٹہ سے چند میل دور زیارت منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا جو کوئٹہ سے زیادہ خنک اور یقیناً نسبتاً پرسکون مقام تھا۔

زیارت کی ریذیڈنسی جہاں ہم نے قیام کیا، ایک نہایت خوش منظر، خوبصورت، پرانی اور دو منزلہ عمارت تھی۔ یہ عمارت ایک بلند پہاڑی پر کسی نگہدار سنتری کی مانند ایستادہ تھی۔ اس کے وسیع و عریض لان اور باغ میں چڑیاں علی الصباح نغمہ صبح گاہی الاپا کرتیں اور شام کو رین بسیرے کے گیتوں کی تانیں اڑاتیں۔ پھل دار درختوں کے جھنڈ اور رنگ برنگ پھولوں کے تختے اس کے حسن کو دوبالا کرتے تھے۔ اس جگہ جو حسن و سکون تھا۔ قائداعظم کو اس سے پیار ہو گیا تھا۔

ایک روز کوئٹہ ڈویژن کے کمشنر کی اہلیہ مسز خان نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ اپنے ایک مریض کے معائنہ کے لیے زیارت آ رہے ہیں اس لیے کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قائداعظم کا معائنہ ان سے کرا دیا

جائے۔ جب میں نے اپنے بھائی سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ انہیں یقین ہے کہ وہ بیمار نہیں ہیں بس ان کا معدہ اگر خوراک قدرے بہتر انداز میں ہضم کرنے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنے قدموں پر کھڑے ہونے لگیں گے۔ وہ ہمیشہ ڈاکٹر کے ایسے مشوروں اور ہدایات سے گریز کرتے تھے کہ کیا کریں، کیا کھائیں، کتنا کھائیں، کب سوئیں اور کتنی دیر آرام کریں اور گریز کی یہی پرانی عادت ایک مرتبہ پھر عود کر آئی تھی۔

اب تک وہ تفصیلی طبی معائنہ سے احتراز کرتے رہے تھے کیونکہ وہ خود کو کلی طور پر ڈاکٹروں کی ہدایات کا پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی خود اعتمادی سے ہی صحت یاب ہو جائیں گے تاہم انہوں نے اس حقیقت کو بھی جان لیا تھا کہ ان کی یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ اسی لیے زندگی میں پہلی مرتبہ ان کی صحت، خود ان کے لیے پریشانی کا سبب بن گئی۔ چنانچہ اس صبح جب انہوں نے یہ بات مان لی کہ اب انہیں صحت کے سلسلے میں زیادہ خطرات مول لینے نہیں چاہئیں اور یہ کہ اب انہیں واقعی اچھے طبی مشورے اور توجہ کی ضرورت ہے تو میں بے حد خوش ہوئی چنانچہ میں نے بلا تاخیر قائد کے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین سے کہا کہ وہ فوراً کابینہ کے سیکرٹری جنرل چودہری محمد علی کو ٹیلیفون کر کے کہیں کہ لاہور کے ممتاز فزیشن ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو فوراً بذریعہ طیارہ زیارت بھیجنے کا انتظام کریں۔ یہ ۲۱ جولائی، ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔

پیغام بھیجا جا چکا تھا اور ہم بے چینی سے کرنل الٰہی بخش کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ قائد کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر نہایت کمزور تھے لیکن ان کا ذہن فعال اور چاق و چوبند تھا۔ ان کی روح اسی طرح بے خوفی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ان کا جوش و جذبہ ماند نہیں پڑا تھا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے بہت سے معرکے سر کیے تھے اور اب زندگی کے اس مرحلے پر وہ خرابی صحت اور بیماری کے خلاف پورے اعتماد سے نبرد آزما تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی جدوجہد اور مخالفت کے پرخطر آتشیں راستے پر چلتے ہوئے گزاری تھی جسے اب وہ بے عملی کی راکھ میں ختم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب بھی اکثر مجھ سے نئے آئین، کشمیر اور مہاجرین کے مسائل پر گفتگو کرتے رہتے۔ میں اس گفتگو میں اس روح کے کرب و اذیت کو محسوس کر سکتی تھی جو بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس بہت کم مہلت اور تھوڑی توانائی باقی رہ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اس بات کے قائل تھے کہ شمع کو اس وقت تک اپنی روشنی پھیلاتے رہنا چاہیے جب تک کہ صبح اس کا کام نہ سنبھال لے۔

جمعہ ۲۳ جولائی، ۱۹۴۸ء کی سہ پہر، دیر گئے جب فرخ امین نے مجھے بتایا کہ کرنل الٰہی بخش زیارت پہنچ گئے ہیں اور قائد کا معائنہ کرنے کے لیے نیچے موجود ہیں تو میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے یہ خوشخبری اپنے بھائی کو سنائی تو انہوں نے نہایت ٹھنڈے اور غیر جذباتی لہجے میں کہا:

ڈاکٹر سے کہو کہ وہ میرا معائنہ کل کرے۔ اس وقت بہت شام ہو چکی ہے اور میں بے آرامی نہیں چاہتا۔

جس لاتعلقی اور سرد مہری سے انہوں نے یہ خبر سنی تھی اس پر میں پریشان ہوگئی میں نے انہیں منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ڈاکٹر کو معائنہ کی اجازت دے دیں کیونکہ اپنی زندگی سے کھیلنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ وہ جواب میں صرف مسکرا دیئے اور میں لاجواب ہوگئی۔

میں اگلی صبح کرنل الٰہی بخش کو قائداعظم کے پاس لے گئی اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اپنے مریض سے کوئی سوال کرتا انہوں نے کہا:

''مجھے امید ہے ڈاکٹر آپ کا سفر اچھا رہا ہوگا''

اور اب ڈاکٹر ان سے ان کی تکلیف، ان کی بیماری اور شکایات کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ قائداعظم نے ۱۹۳۴ء کے بعد سے اپنی بیماریوں کے بارے میں مختصراً بتایا۔ تاہم ان کا تمام زور اسی بات پر تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور اگر ان کا معدہ بالکل صحیح طریقہ سے کام کرنے لگے تو وہ بہت جلد معمول کے مطابق کام کرنے لگیں گے، انہوں نے کہا:

> گذشتہ چودہ برس سے میں چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہوں۔ میں جانتا ہی نہ تھا کہ بیماری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن گذشتہ چند برس سے اکثر و بیشتر نزلہ، بخار اور کھانسی کی شکایت ہو جاتی ہے اور چند دن آرام کے بعد میں ٹھیک ہو جاتا ہوں، لیکن حال ہی میں نزلہ، بخار اور کھانسی کے حملے جلد جلد ہونے لگے ہیں ان کی نوعیت بھی شدید ہوتی ہے جن سے میں بالکل نڈھال ہو چکا ہوں۔

ان چند جملوں کو ادا کر کے وہ بے سدھ سے ہو گئے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھنے کے لیے ان کا بایاں ہاتھ تھاما۔ اس وقت بھی وہ مسلسل کھانس رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے کہنا شروع کیا:

> چند ہفتے پہلے مجھ پر نزلہ، سردی کا حملہ ہوا جب سے میں پنسلین کی گولیاں کھا رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ جسمانی طور پر کوئی خرابی نہیں ہے میری تمام پریشانیوں کی جڑ میرا معدہ ہے۔ کوئی پندرہ برس قبل لندن میں ڈاکٹروں نے مجھے پیٹ کے آپریشن کا مشورہ دیا تھا لیکن جب میں نے جرمنی میں ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں کہا کہ میرا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسی دوران میرے بمبئی کے ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ مجھے دل کی تکلیف ہے، دیکھا آپ نے خود ڈاکٹر بھی آپس میں کسی بات پر متفق نہیں ہیں۔[۲۶]

کرنل الٰہی بخش نے تفصیلی معائنہ کے بعد کہا:

> جناب آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے، لیکن میں آپ کے سینے اور پھیپھڑوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے لیے آپ کے خون اور بلغم کا معائنہ کرانا ہوگا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ ضروری

سامان وآلات کے علاوہ کچھ ڈاکٹر مجھے فراہم کیے جائیں تا کہ اس کام میں وہ میری مدد کر سکیں۔[۲۷]

قائداعظم خاموشی سے ڈاکٹر کی باتیں سنتے رہے۔ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

جناب عالی آپ کو قوت بخش غذا خاصی مقدار میں کھانی چاہیے۔ناشتہ میں آپ دلیہ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی، کافی اور دودھ لیں۔ لنچ میں مرغی کا قیمہ، سبزیاں اور کسٹرڈ یا جیلی کھائیں۔ رات کے کھانے میں مچھلی اور اپنی پسندیدہ ساس کے علاوہ سبزیاں اور پھل پڈنگ اور کافی لیا کریں۔

ڈاکٹر یہ تو آپ نے بہت کچھ بتادیا، آپ کا کیا خیال ہے کہ میرا کمزور معدہ یہ سب کچھ برداشت کرے گا؟

قائداعظم نے سوال کیا۔

جناب عالی! آپ کو ایسی غذا کی ضرورت ہے جس میں کافی حرارے ہوں، آپ کے لیے یہ بے حد ضروری ہے، ڈاکٹر نے اصرار کیا۔[۲۸]

اگلی صبح کوئٹہ کے سول سرجن ڈاکٹر صدیقی اور کلینیکل پیتھالوجسٹ ڈاکٹر محمود ضروری آلات اور ساز و سامان کے ساتھ زیارت آ گئے۔انہوں نے قائد کے خون اور بلغم کے نمونے لیے اور اسی شام مجھے یہ تشویشناک اطلاع ملی کہ ٹیسٹ کے نتائج وہی نکلے جن کا خطرہ تھا اور مجھے یوں لگا جیسے دنیا میرے قدموں سے کھسک رہی ہو۔میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ یہ تشویشناک اطلاع خود کرنل الٰہی بخش انہیں دیں تا کہ غذا، آرام اور علاج کے معاملے میں ان کا مکمل تعاون حاصل ہو سکے۔ڈاکٹر الٰہی بخش ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے انتہائی تشویش انگیز لہجے میں کہا:

جناب! میرا خیال ہے کہ جو ٹیسٹ لیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پھیپھڑے سخت متاثر ہیں۔

قائد نے یہ خبر نہایت تحمل اور خاموشی کے ساتھ سنی اور چند منٹ بعد کہا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تپ دق ہے۔

کرنل الٰہی بخش نے کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے پھر کہا

مجھے بتاؤ ڈاکٹر یہ بیماری مجھے کتنے عرصے سے ہے؟

میرا خیال ہے جناب کہ کم از کم دو سال سے آپ کو یہ بیماری لاحق ہے۔لیکن اس سلسلے میں کوئی قطعی رائے دینے سے قبل میں آپ کے سینے کا ایکسرے دیکھنا چاہوں گا۔پھر بھی جناب، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ معاملہ بہت زیادہ سنگین نہیں ہے۔ہم اپنی سی ہر ممکن کوشش کریں گے اور آپ کے جسمانی نظام نے اگر

علاج کو اچھی طرح قبول کرلیا تو آپ جلد ہی بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ کرنل الٰہی بخش نے کہا۔

کیا مس جناح کو اس کے بارے میں علم ہے۔ کیا تم نے انہیں بتا دیا ہے؟

جی ہاں جناب، میں نے انہیں بتا دیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا کر کے غلطی کی ہے وہ بہر حال ایک عورت ہے۔ قائد نے کہا۔[۲۹]

اسی لمحہ، میں کمرے میں داخل ہوئی اور قائد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

تمہارے خیال میں، میں کتنے عرصہ تک صاحب فراش رہوں گا؟ تمہیں معلوم ہی ہے کہ میری ذمہ داریاں بے پناہ ہیں اور ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔

جناب اس سوال کا جواب دینا قبل از وقت ہے لیکن آپ کی جلد صحت یابی کے لیے ہمارے بس میں جو کچھ ہے ہم کریں گے۔ کرنل الٰہی بخش نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

اب میں انے بھائی کے ساتھ تنہا تھی۔ ہر چند کہ ان کے چہرے پر زردی پھیل رہی تھی اور یہ زردی ان کی تھکن اور کمزوری کی آئینہ دار بھی تھی پھر بھی انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا:

فاطی: دیکھا، تم نے ٹھیک ہی کہا تھا، مجھے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے بہت پہلے مشورہ کر لینا چاہیے تھا ۔۔لیکن مجھے اس پر افسوس نہیں۔۔انسان صرف جدوجہد ہی کر سکتا ہے۔۔تقدیر کی زبان ہمیشہ گونگی ہی ہوتی ہے۔۔جب تک میرے دم میں دم ہے میں اپنے مورچے پر ڈٹا رہوں گا۔۔تم جانتی ہو کہ میرا ہمیشہ یہی اصول رہا ہے۔۔دوسروں کا مشورہ کبھی آنکھیں بند کر کے قبول نہ کرو۔۔میں نے ہمیشہ۔۔اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا ہے۔۔کٹھن اور سخت مراحل سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ چند ماہ قبل ہی انہوں نے پشاور میں اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

آپ اپنے بیش قیمت تجربے اور اپنی زندگی میں پیش آنے والے کٹھن اور سخت مراحل سے بہت کچھ سیکھیں گے۔

غرض اپنی متعین کردہ راہ پر چلنا اور کٹھن مراحل سے سبق حاصل کرنا زندگی بھر ان کے کردار کا بنیادی اور اہم وصف رہا۔

ان کی خوراک میں اضافہ میرے لیے بہت دل خوش کن تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب وہ گزشتہ کئی ہفتوں کے مقابلے میں زیادہ کھانے لگے تھے۔ ان کی بھوک چمکانے کے لیے میں نے امانت علی کو باورچی کی حیثیت سے رکھ لیا تھا۔ امانت علی نے کھانا پکانے کا فن پیرس کے رٹز ہوٹل میں سیکھا تھا اور وہ کچھ عرصہ کپورتھلہ کے مہاراجہ کا داروغہ مطبخ بھی رہا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائد کا ٹمپریچر لینے کے لیے پہلی مرتبہ ایک لیڈی کمپاؤڈر بھی رکھی۔ ایک دن قائداعظم

نے لیڈی کمپاؤڈر سے پوچھا:

میرا ٹمپریچر کیا ہے؟

لیڈی کمپاؤڈر نے بڑے مضبوط لہجہ میں کہا۔ جناب! یہ بات میں صرف ڈاکٹر صاحب کو بتا سکتی ہوں۔

انہوں نے اصرار کیا۔ ''لیکن مجھے اپنا ٹمپریچر معلوم ہونا چاہیے''۔

مجھے افسوس ہے جناب، میں آپ کو نہیں بتا سکتی''۔ لیڈی کمپاؤڈر نے جواب دیا۔

لیڈی کمپاؤڈر کے کمرے سے جاتے ہی انہوں نے مسکرا کر مجھ سے کہا:

''مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔۔ایسے لوگ جو اپنی بات پر ڈٹے رہیں۔۔اور کسی دباؤ میں نہ آ سکیں۔[۳۰]

اگرچہ کسی شخص کو قائداعظم سے ملاقات کی اجازت نہ تھی مگر جب واشنگٹن میں متعین ہمارے سفیر جناب حسن اصفہانی زیارت میں ہمارے ہاں آئے تو قائد ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جناب اصفہانی کئی برس سے قائد کے قریبی ساتھیوں اور معتمدین میں سے تھے۔ وہ جب اپنے رہنما سے ملاقات کر کے نیچے آئے تو زار و قطار رونے لگے۔ مسٹر اصفہانی غالباً اس منظر کی تاب نہ لا سکے تھے کہ بہت سے معرکوں میں سرخرو ہونے والا آہنی عزم وارادے والا شخص یوں بے بسی اور لاچاری کے ساتھ بستر علالت پر پڑا تھا اور نہایت کمزور انداز میں جینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے کہا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو وہ امریکہ سے طبی ماہرین اور ادویات بھی قائد کے علاج کے لیے بخوشی بھجوا سکتے ہیں۔ اس پر مسٹر اصفہانی کو بتایا گیا کہ اگر ایسا ضروری سمجھا گیا تو ڈاکٹر صاحبان اس کے لیے بخوشی درخواست کریں گے۔

دریں اثناء ڈاکٹر الٰہی بخش کی درخواست پر لاہور سے ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ایکسرے سپیشلسٹ ڈاکٹر عالم اور کلینیکل اسپیشلسٹ ڈاکٹر غلام محمد، ایکسرے کے ساز و سامان کے ساتھ کوئٹہ پہنچ گئے۔ ان کے معائنے اور ٹیسٹ سے ڈاکٹر الٰہی بخش کی رائے اور تشخیص کی تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ رات کو قائد کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ پہلے پہل قائد نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ان کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو رہی ہے اور یہ کہ رات کے لیے نرس مقرر کرنا محض رقم ضائع کرنا ہے لیکن بالآخر وہ راضی ہو گئے اور انہوں نے کہا:

کئی ہفتوں سے۔۔۔میری بہن دن رات میرے بستر سے لگی بیٹھی رہی ہے۔۔۔شاید اب وہ تھک گئی ہو گی۔۔۔ہاں آپ رات کے لیے ایک نرس مقرر کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس طرح سسٹر فلس ڈنہم جو سول ہسپتال کوئٹہ میں ملازم تھیں زیارت آ گئیں۔ وہ نہایت ہوشیار اور مستعد نرس ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے قائد بھی اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ایک دن سسٹر ڈنہم نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو بتایا کہ قائد ''ریشمین'' پاجامہ پہنتے ہیں۔ یہ انکی دیرینہ عادت تھی اور اس وجہ سے سردی سے اکثر ٹھٹھرتے تھے۔ یہ سن کر

ڈاکٹر نے کراچی سے viyella منگوایا اور میں نے ان کے لیے کچھ پاجامے تیار کرا دئے۔تب یہ دیکھ کر ہماری امید بندھی کہ اب وہ پہلے سے زیادہ آرام سے ہیں، دیر تک سوتے ہیں اور کافی خوراک کھانے لگے ہیں۔ان کا ٹمپریچر بھی معمول پر آ گیا، کھانسی بھی تقریباً بند ہوگئی، اور خون کا دباؤ بھی باعث تشویش نہیں رہا تھا۔

جولائی کے آخر میں وزیراعظم لیاقت علی خان، چوہدری محمد علی کے ساتھ پیشگی اطلاع کے بغیر زیارت پہنچ گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے قائد کی صحت اور ان کے علاج کے بارے میں دریافت کیا۔ڈاکٹر نے کہا چونکہ انہیں میں نے قائد کے علاج کے لیے بلایا ہے اس لیے وہ اپنے مریض کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار صرف مجھ سے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر کا یہ جواب سن کر لیاقت علی خان نے کہا:

''لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے میں ان کی صحت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں''

اس پر ڈاکٹر نے نہایت نرمی سے جواب دیا

''ٹھیک ہے جناب! لیکن میں مریض کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔''[۳۱]

جس وقت قائد کو یہ اطلاع دی گئی کہ وزیراعظم اور سیکرٹری جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں، میں قائد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، قائد نے چند منٹ کے توقف کے بعد کہا:

''نیچے جاؤ۔۔۔وزیراعظم سے کہو۔۔۔۔میں ان سے ملاقات کے لیے تیار ہوں''

''جن! ''میں نے پریشان ہو کر کہا۔''رات بہت ہوگئی ہے ان سے صبح مل لینا''۔

''نہیں انہیں اسی وقت آنے دو۔۔۔۔''۔

وہ دونوں تقریباً ادھے گھنٹے تک قائد کے ساتھ رہے۔پھر جوں ہی لیاقت علی خان نیچے آئے میں اپنے بھائی کے پاس اوپر پہنچی۔اس وقت وہ بیحد تھکے ہوئے تھے۔چہرے پر نقاہت طاری تھی۔انہوں نے مجھ سے پھلوں کا شربت مانگا اور کہا''مسٹر محمد علی کو بھیج دو۔۔۔۔''

کابینہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی کوئی پندرہ منٹ ان کے ساتھ رہے اس کے بعد جب قائد اکیلے ہوئے تو میں پھر ان کے پاس گئی۔میں ان سے معلوم کیا کہ وہ جوس لیں گے یا کافی۔لیکن اس وقت ان کا ذہن کچھ سوچنے میں اتنا مصروف تھا کہ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور انہوں نے مجھ سے کہا''بہتر ہے تم۔۔۔نیچے جاؤ۔۔۔۔اور ان کے ساتھ ڈنر کرو۔''

''نہیں''، میں نے کہا۔''میں آپ کے پاس رہوں گی اور یہیں کھانا کھاؤں گی''۔

'' نہیں۔۔۔۔یہ بات ٹھیک نہیں ۔۔۔۔ وہ لوگ ۔۔۔۔یہاں ہمارے مہمان

ہیں۔۔۔۔جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔'' قائد نے اصرار کیا۔

۱۴ اگست کا وہ دن جب ہماری قوم اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منانے والی تھی قریب آ رہا تھا اور وہ ڈاکٹروں کے مشورے کو پس پشت ڈال کر اس پیغام کے بارے میں غور وفکر کر رہے تھے جو وہ اس موقع پر اپنی قوم سے خطاب کے موقع پر دینا چاہتے تھے۔ گرتی ہوئی اور جواب دیتی ہوئی صحت کے باوجود وہ اس پیغام کی تیاری میں مصروف تھے۔ یوم آزادی کے موقع پر جو پیغام ان کی طرف سے جاری ہونے والا تھا اس میں کہا گیا تھا:

> یاد رکھیے۔ کہ قیام پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔۔۔۔ مجھے اپنے عوام پر مکمل بھروسہ اور اعتماد ہے۔۔۔ ہمارے دشمن جو اس نئی مملکت کا گلا اس کے قیام کے فوراً بعد ہی مختلف ذرائع سے گھونٹ دینا چاہتے تھے اب اپنا یہ دلی مقصد اقتصادی جوڑ توڑ کے ذریعہ حاصل کرنے کی توقع کر رہے ہیں۔ بغض وعناد اور نفرت وکدورت کے منفی جذبات پر مبنی جس قدر وسائل دے سکتے ہیں اور بدخواہی کے جو ہتھکنڈے استعمال کر سکتے ہیں ان سے کام لے کر ان دشمنوں نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ پاکستان دیوالیہ ہو جائے گا، اور دشمن جو مقصد اپنی تلوار اور پینتروں سے حاصل نہیں کر سکا وہ بدحال معیشت کے ذریعہ حاصل ہو جائے گا۔ مگر ان تمام پیغمبران تلبیس کی یہ باتیں قطعی غلط ثابت ہوئیں ہمارا پہلا بجٹ، بچت کا بجٹ تھا۔ توازن تجارت ہمارے حق میں ہے اور اقتصادی شعبہ میں مستقل اور ہمہ جہت بہتری ہو رہی ہے''۔ ۳۲

چند دن کے بعد ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ قائد کے خون کا دباؤ بہت کم ہو گیا ہے، ان کے پیروں پر ورم آ گیا ہے اور انہیں پیشاب بھی کم آنے لگا ہے۔ طویل صلاح ومشورے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا کہ قائد کا دل اور گردے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں زیارت کی بلندی ان کی طبعیت کے موافق نہیں رہی تھی۔ قائد بھی ڈاکٹروں کے اس خیال سے متفق ہو گئے لیکن ان کا اصرار یہی تھا کہ انہیں ۱۴ اگست کے بعد کوئٹہ منتقل کیا جائے۔ یعنی نوزائیدہ مملکت کی آزادی کی پہلی سالگرہ منائے جانے کے بعد، لیکن ڈاکٹر اس وقت تک انتظار کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے ۱۳ اگست کو زیارت سے کوئٹہ روانہ ہونے کی تیاری کر لی۔ ۳۳

وہ بضد تھے کہ پاجامہ سوٹ میں ہرگز سفر نہیں کریں گے کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں ایک گونہ اسی بات پر خوش تھی کہ وہ اب بھی زندگی میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ان کے لیے بالکل نیا سوٹ نکالا۔ یہ سوٹ انہوں نے پہلے کبھی نہیں پہنا تھا۔ سوٹ کی مناسبت سے ایک ٹائی نکالی اور رومال کوٹ کے اوپر کی جیب میں رکھا۔ انہیں چمکتے ہوئے پمپ جوتے پہنائے۔ ایک اسٹریچر پر انہیں اوپر سے نیچے لایا گیا اور بڑی بمبر کار کی

پچھلی نشست پر نیم دراز حالت میں انہیں بٹھا دیا۔ یوں ہم نے کوئٹہ کا سفر شروع کیا۔ میں ان کے ساتھ اور سسٹر ڈنہم فاضل کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ قائد کے اے ڈی سی شوفر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔

کار آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔ دھچکوں اور جھٹکوں سے بچنے کے لیے اس کی رفتار سست تھی۔ راستہ میں ہم دو جگہ رکے۔ قیام کے دوران میں نے انہیں چائے اور بسکٹ دیئے۔ ہمیں کوئٹہ پہنچنے میں چار گھنٹے لگے۔ اس دوران ہر لمحہ یہی خیال میرے لیے سوہان روح بنا رہا کہ وہ سفر کی یہ صعوبت برداشت کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ جونہی ہم کوئٹہ ریذیڈنسی پہنچے جہاں ہمیں قیام کرنا تھا، ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور مجھے یقین دلایا کہ قائد نے سفر کی تھکن بخوبی برداشت کر لی ہے۔

چند گھنٹے بعد قائد نے ڈاکٹروں سے کہا۔ ''میں یہاں۔۔۔ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ زیارت میں تو سانس لینا بھی دوبھر تھا''۔ [۳۴]

ان کی حالت سنبھلنے لگی تو ڈاکٹر الٰہی بخش نے تجویز کیا کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ اپنی فائلیں دیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے یہ مشورہ اس لیے دیا کہ ان کے نزدیک قائد کے فعال ذہن کو کسی کام میں مصروف رکھنا ہی قائد کے لیے بہتر تھا اس طرح ان کا دھیان بٹ سکتا تھا اور وہ ہر وقت اپنی صحت کی طرف سے تشویش میں مبتلا نہیں رہ سکتے تھے قائد بہت خوش تھے انہوں اس آزادی کو بخوشی قبول کر لیا۔ چند دن بعد ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر روزانہ ان کی مدد سے اپنے کمرے میں چند قدم چلا کریں تا کہ اس کے نتیجے میں ان کا دوران خون بہتر ہو سکے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ تجویز بھی قبول کر لی۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ کئی ہفتوں کے بعد ایک بار پھر وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں گے اور بستر علالت پر ہی دراز نہیں رہیں گے۔ اس بات سے میرے دل کو بڑی تقویت پہنچتی تھی کہ جدوجہد کے آثار اب بھی ان میں تھے پھر ایک جب انہوں نے یہ کہانی سنائی تو یہ امید قوی تر ہو گئی۔

> جانتے ہیں ڈاکٹر! میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ ایک عورت جس نے اپنے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ چل پھر نہیں سکتی۔ وہ بیمار تھی اور کئی مہینوں سے بستر پر دراز تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ جب وہ صحت یاب ہو چکی ہے اس لیے ضروری ہے کہ بستر چھوڑ دے اور چلنا پھرنا شروع کر دے لیکن ڈاکٹروں کی تمام تر درخواستوں کے باوجود وہ چلنے پھرنے پر تیار نہ ہوئی پھر ایک اور ڈاکٹر آیا اس نے عورت کا معائنہ کیا اور اس نے بھی یہی مشورہ دیا۔ اتنا کہہ کر قائد رکے، وہ تھک گئے تھے، ان کا سانس پھول گیا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ ''تب ایک اور ڈاکٹر آیا اور اس نے عورت کی لاعلمی میں ایک جلتا ہوا اسٹوو اس کے بستر کے نیچے رکھ دیا۔ عورت کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کا بستر بس آگ پکڑنے ہی والا ہے۔۔۔ وہ چیختی ہوئی اپنے بستر سے نکل بھاگی۔۔۔'' یہ گفتگو سن کر ہم خوب

ہنسے اور قائد نے خوش دلی سے کہا۔ ''ڈاکٹر کیا تم بھی میرے ساتھ یہی کرنا چاہتے ہو؟''[۳۵]
چند لمحے ٹھہر کر انہوں نے پھر کہا۔ ''ڈاکٹر، میں سگریٹ پینے کا عادی ہوں کئی دن سے میں نے سگریٹ نہیں پی۔۔۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟''
ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا۔ ''جی ہاں جناب! روزانہ صرف ایک سگریٹ پی لیا کریں لیکن دھواں اندر نہ لیں''۔
میں ان کے پسندیدہ برانڈ کی سگریٹ 'کریون۔اے' کا ڈبہ لے آئی وہ ہمیشہ سے بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ روزانہ تقریباً ۵۰ سگریٹ پیا کرتے تھے۔[۳۶]

شام کو جب ڈاکٹر آیا تو اس وقت ایش ٹرے میں سگریٹ کے پانچ ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے استفہامیہ انداز میں اپنے مریض کی طرف دیکھا اور قائد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر میں نے پانچ سگریٹ پیے ہیں۔۔۔ لیکن میں نے دھواں اندر نہیں لیا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسے وہ کسی بچے کی طرح خوش تھے!

اس سال عید الفطر ۲۷ اگست کو پڑ رہی تھی۔[۳۷] اور وہ قوم کے نام اپنا پیغام تیار کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنی طویل سیاسی زندگی کے دوران سینکڑوں سیاسی تقریریں تیار کی تھیں اور یہ ان کی آخری تقریر ثابت ہوئی۔
اس پیغام میں انہوں نے کہا:

> ہم مشترکہ اور اجتماعی کوششوں اور اپنے مستقبل پر اعتماد کے ذریعہ ہی اپنے خوابوں کے پاکستان کو حقیقت کا روپ دے سکتے ہیں۔۔۔[۳۸]
>
> ہمارے لیے گزشتہ عید الفطر جو قیام پاکستان کے فوراً بعد آئی تھی۔ مشرقی پنجاب کے افسوسناک واقعات کے سبب ماند پڑ گئی تھی۔ گزشتہ سال پیش آنے والے خونی واقعات اور ان کے نتائج اور عواقب اور لاکھوں افراد کی ہجرت کے نتیجہ میں ایسا زبردست مسئلہ سامنے آیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے گھر اور بے در انسانوں کے اس جم غفیر کو جو آلام و مصائب کے سیلاب میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا، کنارے لگانے کے لیے ہم نے جو کوششیں کیں اس کے نتیجہ میں ہمارے وسائل اور توانائیاں تقریباً ختم ہو گئیں۔ یہ کام اتنا گراں بار تھا کہ ہم اس کے تلے دب گئے اور بمشکل تمام اپنے سر پانی سے اوپر رکھ سکے۔ بارہ ماہ کا مختصر عرصہ تمام مہاجرین کو آباد کرنے اور ان کو پاکستان میں منفعت بخش روزگار فراہم کرنے کے لیے ناکافی تھا تاہم ان کی آبادکاری میں کافی پیش رفت ہوئی ہے، لیکن ابھی بہت سوں کی آبادکاری باقی ہے۔ ہم اس وقت تک خوشی نہیں منا سکتے جب تک کہ ان مہاجرین میں سے ہر ایک کو ایک مرتبہ پھر اپنے پیروں پر نہ کھڑا کر دیں۔ میں قطعی پر امید ہوں کہ اگلی عید تک یہ

زبردست اور مشکل مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور تمام مہاجرین کو پاکستانی معیشت میں معاشرے کے کارآمد اراکین کی حیثیت سے ضم کرلیا جائے گا۔[۳۹]

اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے انہوں نے مزید کہا:

برادر مسلم ممالک کے لیے میرا پیغام، دوستی اور خیر سگالی سے عبارت ہے ہم سب نہایت پرخطر دور سے گزر رہے ہیں۔ فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں طاقت کی سیاست کا جو ڈرامہ رچایا جارہا ہے اس پر ہم سب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ صرف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے ہی ہم عالمی تنظیموں میں اپنی آواز محسوس کرا سکتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سب سے اپیل کرتا ہوں۔۔۔ آپ خواہ کسی زبان میں اس کو پیش کریں۔۔۔ میرے مشورے کا لب لباب یہی ہے۔۔۔ کہ ہر مسلمان کو ایمانداری، وفاداری اور بے لوثی کے ساتھ پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے۔[۴۰] یہ ان کے آخری سرکاری الفاظ ثابت ہوئے۔[۴۱]

اگست کے اواخر میں قائداعظم پر اچانک مایوسی کا غلبہ ہوگیا۔ ایک دن میری آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے انہوں کہا۔ ''فاطمی اب مجھے زندہ رہنے سے۔۔۔ کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ جتنی جلد میں چلا جاؤں۔۔۔ اتنا ہی بہتر ہے''۔

یہ نہایت مایوس کن اور منحوس الفاظ تھے۔ میں دھک سے رہ گئی۔ یوں جیسے میں نے بجلی کا ننگا تار پکڑ لیا ہو۔ پھر بھی میں نے صبر وضبط سے کام لیا اور کہا ''جن! تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے ڈاکٹروں کو پوری امید ہے''۔

میری یہ بات سن کر وہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں مردنی چھپی تھی۔ انہوں نے کہا ''نہیں۔۔۔ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا''۔

یکم ستمبر کو ڈاکٹر الٰہی بخش نے گھمبیر لہجے میں مجھے بتایا۔ قائداعظم کو ہیمریج ہوگیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ہمیں انہیں کراچی لے جانا چاہیے۔ کوئٹہ کی بلندی ان کے لیے اچھی نہیں ہے۔''

غرض قائد کی صحت بگڑتی چلی گئی۔ ۵ ستمبر کو ان کے بلغم کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلغم میں نمونیہ کے جراثیم موجود ہیں۔ ان کے خون میں انفکشن کی علامات بھی پائی گئیں۔ ان کو سانس لینے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ۷ ستمبر کو میں نے مسٹر اصفہانی کو واشنگٹن فون کیا کہ وہ امریکی ماہرین کو فوراً بذریعہ طیارہ بھیجیں۔ ان ماہرین کے نام ڈاکٹر ریاض نے تجویز کیے تھے۔

اگلے روز میں نے کراچی کے ڈاکٹر محمد علی مستری کو فون کیا کہ وہ فوراً کوئٹہ پہنچیں ادہر ڈاکٹروں کے درمیان

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ انہوں نے صورتحال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب قائد کو فوراً کراچی منتقل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ کوئٹہ کی بلندی ان کے کمزور دل کے لیے مناسب نہ تھی۔ ڈاکٹروں نے بڑے بھاری دل کے ساتھ مجھے اطلاع دی کہ اب کوئی امید باقی نہیں اور صرف کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے۔

جب میں نے اپنے بھائی کو ڈاکٹروں کے اس مشورے سے آگاہ کیا کہ انہیں کراچی لے جایا جائے تاکہ وہ کوئٹہ کی بلندی سے دور رہ سکیں تو انہوں کہا۔ ہاں۔۔۔۔ مجھے کراچی لے چلو۔۔۔ میں وہیں پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ میں وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔'' ان کی آنکھیں بند ہوگئیں اور میں ان کے قریب پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ وہ بے ہوش تھے اور اس بے ہوشی کے عالم میں بھی ان کے خیالوں کی بازگشت میں سنتی رہی۔ وہ بڑبڑا رہے تھے، کشمیر۔۔۔ انہیں فیصلہ کرنے کا۔۔۔ حق دو۔۔۔۔ آئین۔۔۔۔ میں اسے مکمل کروں گا۔۔۔ بہت جلد۔۔۔ مہاجرین۔۔۔ ان کی ہر طرح۔۔۔۔ مدد کرو۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔''

گورنر جنرل کے وائکنگ طیارے کو فوری طور پر کوئٹہ پرواز کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ۱۱ ستمبر کو بعد دوپہر دو بجے کراچی واپس جانے کے لیے ہم ایئرپورٹ پر ہوں گے۔

جب انہیں ایک اسٹریچر پر ڈال کر وائکنگ کے کیبن میں لے جایا جا رہا تھا تو طیارے کا کیبن اور عملہ انہیں سلامی دینے کے لیے ایک قطار میں کھڑے تھے قائد نے بمشکل تمام اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ ہم نے ان کو احترام کے ساتھ ان نشستوں پر لٹا دیا جنہیں اگلے کیبن میں ایک عارضی بستر کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ میں ڈاکٹر مستری اور سسٹر ڈنہم بیٹھے تھے۔ پائلٹ نے ہمیں خبردار کیا کہ کچھ وقفے کے لیے اسے طیارے کو سات ہزار فٹ کی بلندی پر اڑانا ہوگا اور جوں ہی طیارہ بلوچستان کا پہاڑی علاقہ پار کر لے گا تو طیارے کو پھر پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر لے آئے گا۔ آکسیجن سلنڈر اور گیس ماسک تیار تھے۔ زیادہ بلندی پر مجھے ہی انہیں آکسیجن دینی تھی۔

ہم جلد ہی فضا میں بلند ہو گئے۔ طیارہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ قائد کو سانس لینے میں دقت محسوس ہوئی تو میں نے گیس ماسک ان کے منہ سے لگا دیا۔ کچھ دیر تک وہ آکسیجن لیتے رہے اور پھر کمزور ہاتھ سے ماسک کو ہٹا دیا اور مجھے یوں دیکھا گویا وہ کہہ رہے ہوں۔ ''سب کچھ بیکار ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے''۔

میں نے ڈاکٹر مستری سے کہا کہ وہ ڈاکٹر الٰہی بخش کو بلا لائیں اور پھر مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر الٰہی بخش انہیں آکسیجن لینے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اپنی تمام زندگی میں، اس سے زیادہ پریشان کن سفر میں نے کبھی نہیں کیا۔ دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سہ پہر سوا چار بجے ماری پور ایئرپورٹ پر اترے۔ یہ وہی ایئرپورٹ تھا جہاں ایک سال قبل وہ نہایت پراعتماد انداز میں اور اس امید کے ساتھ اترے تھے کہ وہ پاکستان کو عظیم قوم بنائیں

گے۔اس وقت ائیر پورٹ پر ہزاروں افراد جن میں کابینہ کے وزراء اور سفارتی مشنوں کے ارکان بھی شامل تھے ان کے استقبال کے لیے موجود تھے لیکن اس دن جیسا کہ پہلے ہدایت کردی گئی تھی، ہوائی اڈے پر کوئی نہ تھا۔

جونہی ہم طیارے سے باہر آئے گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کرنل جیوفری ناولز نے ہمارا استقبال کیا۔ قائد کو ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک فوجی ایمبولینس میں لے جایا گیا۔ یہ ایمبولینس انہیں گورنر جنرل ہاؤس لے جانے کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں اور سسٹر ڈنہم ان کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھے تھے۔ایمبولینس بہت سست روی سے چل رہی تھی ہماری پارٹی کے دوسرے لوگ گاڑیوں سے روانہ ہو چکے تھے۔صرف ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر مستری اور ملٹری سیکرٹری گورنر جنرل کی کیڈلک کار میں ہماری ایمبولینس کے پیچھے تھے۔

ابھی ہم نے چار میل کا سفر ہی طے کیا تھا کہ ایمبولینس نے اس طرح ہچکیاں لیں جیسے اسے سانس لینے میں مشکل درپیش آ رہی ہو۔اور پھر وہ اچانک رک گئی۔کوئی پانچ منٹ بعد میں ایمبولینس سے باہر آئی تو مجھے بتایا گیا کہ ایمبولینس کا پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔اگرچہ ڈرائیور نے انجن سے الجھنا شروع کر دیا تھا لیکن بیمبولینس کو نہ اسٹارٹ ہونا تھا نہ ہوئی میں پھر ایمبولینس میں داخل ہوئی تو قائد نے آہستہ سے ہاتھ کو حرکت دی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا میں نے جھک کر آہستگی سے کہا۔''ایمبولینس کا انجن خراب ہو گیا ہے''۔

انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔عموماً کراچی میں تیز سمندری ہوائیں چلتی رہتی ہیں جس سے درجۂ حرارت قابل برداشت رہتا ہے اور گرم دن کی حدت سے نجات مل جاتی ہے لیکن اس دن ہوا بالکل بند تھی اور گرمی ناقابل برداشت! قائد کی بے آرامی میں اضافہ کا سبب یہ تھا کہ بے شمار مکھیاں ان کے چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں، اور ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ مکھیوں کے حملے سے بچنے کے لیے انہیں اٹھا بھی سکتے۔سسٹر ڈنہم اور میں باری باری ہاتھ سے ان کے چہرے پر پنکھا جھل رہے تھے۔ہم منتظر رہے کہ شاید کوئی اور ایمبولینس آ جائے۔ ہر لمحہ کرب واذیت کا ایک لامتناہی لمحہ تھا۔قائد کو ہم کیڈلک میں بھی منتقل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس میں اسٹریچر سما سکتا چنانچہ امید وبیم کی کیفیت میں ہم انتظار کرتے رہے۔۔۔۔

قریب ہی مہاجرین کی سینکڑوں جھگیاں موجود تھیں۔مہاجرین اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ انہیں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ ان کا وہ قائد جس نے انہیں ایک وطن دیا ہے ان کے درمیان موجود ہے اور ایک ایسی ایمبولینس میں بے یار و مددگار پڑا ہے جس کا پٹرول بھی ختم ہو گیا ہے۔کاریں ہارن بجاتی قریب سے گزر رہی تھیں۔بسیں اور ٹرک اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے اور ہم وہاں ایک ایسی ایمبولینس میں بے حس وحرکت پڑے تھے جو ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی اور اس بے حس وحرکت ایمبولینس میں ایک انتہائی قیمتی زندگی آتی جاتی

سانس کے ساتھ قطرہ قطرہ ختم ہو رہی تھی۔ ہم وہاں کوئی ایک گھنٹے منتظر رہے۔ میری زندگی میں کوئی اور گھنٹہ اتنا طویل اور دردناک نہیں آیا۔ تب خدا خدا کر کے ایک اور ایمبولینس آئی۔ انہیں سٹریچر کے ذریعہ نئی ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور یوں آخر کار ہم پھر گورنر جنرلز ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ گورنر جنرلز ہاؤس میں انہیں آہستگی سے بستر پر لٹا دیا گیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ ماری پور ائیر پورٹ پر اترے ہوئے ہمیں دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ کتنی عجیب بات تھی دو گھنٹے میں ہم کوئٹہ سے کراچی پہنچے اور دو گھنٹے ہمیں ماری پور سے گورنر جنرل ہاؤس پہنچنے میں لگے۔

ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور دبے الفاظ میں کہا۔ ''فضائی سفر کے لیے ہی ان کی حالت کیا کم خراب تھی کہ ایمبولینس کا یہ تکلیف دہ واقعہ بھی پیش آ گیا''۔

جلد ہی وہ گہری نیند سو گئے اور ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے گورنر جنرلز ہاؤس سے چلے گئے کہ وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ اب میں اپنے بھائی کے ساتھ بالکل تنہا تھی میرا بھائی بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ میرے ذہن میں گویا ایک وجدانی تصور ابھرا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ پرسکون نیند بجھنے والی شمع کی لو کی آخری تیز چمک ہے۔ میں خاموش تھی اور خاموشی میں اپنے بھائی سے مخاطب تھی:

> ''اوہ جن! کاش ڈاکٹر میرا تمام خون نچوڑ کر تمہیں دے دیں تا کہ تم زندہ رہو۔ کاش خدا میری زندگی کے تمام برس لے کر تمہیں دے دے تا کہ تم ہماری قوم کی رہنمائی کرتے رہو تو میں خدا کی کتنی شکر گذار ہوں گی''۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرسکون اور بے خلل نیند کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا۔ سر اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے قریب آنے کو کہا آخری مرتبہ کوشش کر کے زیر لب مجھ سے مخاطب ہوئے: '' فاطمی خدا حافظ۔۔۔لا الہ۔۔۔الا اللہ۔۔۔محمد۔۔۔الرسول۔۔۔اللہ''۔ پھر ان کا سر دائیں جانب کو آہستگی سے ڈھلک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

چیختی، دہاڑیں مارتی میں کمرے دوڑتی ہوئی باہر آئی ''ڈاکٹر، ڈاکٹر جلدی کرو میرا بھائی مر رہا ہے۔ ڈاکٹر، ڈاکٹر کہاں ہو؟

چند ہی منٹ میں تمام ڈاکٹر جمع ہو گئے۔ انہوں نے قائد کا معائنہ کیا، انہیں انجکشن دیئے۔ میں وہاں بے حس و حرکت گم صم کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے میرے بھائی کے جسم کو سر سے پیر تک سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گئی۔ موت انہیں اس زندگی کی طرف لے گئی جو لافانی ہے ابدی ہے۔

کرنل الٰہی بخش بوجھل قدموں سے میرے پاس آئے۔ دایاں ہاتھ نہایت نرمی سے میرے بائیں شانے

پر رکھا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ان آنسوؤں نے الفاظ و آواز کے بغیر ہی مجھے ہلاکت آفریں خبر سنا دی۔ میری آنکھیں خشک تھیں۔ آنسوؤں کے سوتے ہی سوکھ گئے تھے۔ میں چیخنا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی لیکن میری آواز، خاموشی کی پاتال میں کھوگئی تھی۔ میں اپنے وجود کو بوجھل قدموں پر گھسیٹتی ہوئی قائد کے بستر مرگ کی طرف بڑھی اور لکڑی کے بے جان شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

قائد کی موت کی اطلاع نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیل گئی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے بلند و بالا آہنی گیٹ، جن پر بالعموم اس لیے سخت حفاظتی پہرا رہتا ہے کہ کوئی غیر مجاز شخص اندر داخل نہ ہو سکے کھول دیے گئے۔ ہر طرف سے لوگوں کو جم غفیر کی آمد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس کمرے میں بھی آ گئے جہاں قائد پرسکون یا بدی نیند سو رہے تھے۔ ان پر وہ گہری نیند طاری تھی جس سے اب بیداری ممکن نہ تھی۔ ہر طرف آہ و بکا، نالہ وشیون، ہچکی اور آہوں اور سر پیٹنے کی آوازیں تھیں۔ میں اپنے ماحول سے بے خبر وہیں بیٹھی تھی۔ وقت کا شمار بھول گئی تھی۔ اس ناقابل تلافی نقصان پر میں اپنے وجود کو بھی فراموش کر چکی تھی۔

مجھے نہیں پتہ کہ میں کتنی دیر تک اس سفید چادر کو دیکھتی رہی جو میرے بھائی کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

ہاں البتہ مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک معمر خاتون نے جنہیں نہ میں نے کبھی دیکھا تھا اور نہ میں ان سے واقف تھی، میری گردن میں بازو ڈالے اور نہایت آہستگی سے میرے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

انا للہ وانا الیہ راجعون

حوالہ جات

۱۔ مس فاطمہ جناح ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء کو رتن بائی کے انتقال کے بعد مالا بار ہل پر واقع جناح کے بنگلے پر منتقل ہو گئی تھیں اور اس وقت سے مستقل قائداعظم کے ساتھ رہیں۔

۲۔ جناح کا قد پانچ فٹ ساڑھے گیارہ انچ تھا۔

۳۔ قائداعظم نے ۱۹ نومبر ۱۹۴۰ء کو یہ تقریر کی تھی۔

۴۔ جمیل الدین احمد (مرتبہ) Speeches and Writings of Mr. Jinnah (لاہور: شیخ محمد اشرف، ساتواں ایڈیشن، ۱۹۶۸ء) ۱:۱۹۹؛ آئندہ اس کتاب کا حوالہ کتاب کے نام کے تحت آئے گا۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۰۸۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۱۰۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۰۔۲۱۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔

۱۰۔ مسلم لیگ کا اجلاس ایسٹر کی تعطیلات کے دوران ۱۲ اپریل سے ۱۵ اپریل ۱۹۴۱ء تک ہوا تھا۔

۱۱۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء کو اجلاس کے پہلے دن استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین عبدالحمید خان کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد جناح ابتداً اردو میں مختصراً اور بعد ازاں انگریزی میں تقریر کی کیونکہ ان کی طبیعت ابھی تک ناساز تھی، ان کا صدارتی خطبہ ۱۴ اپریل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اس دن انہوں نے ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ پر مشتمل تقریر کی جو یقیناً ایک ایسے شخص کے لیے جس کو تین روز قبل نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہو چکا ہو ایک کارنامہ تھا۔ جلوس اور اور پرچم کشائی کی تقریب میں جو ۱۱ اپریل کو تھی انہوں نے اپنی نیابت کے لیے امیر محمد خان راجہ صاحب محمود آباد کو مقرر کیا تھا جو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے خازن تھے۔ راقم الحروف اجلاس کے دوران کل وقت وہاں موجود تھا۔ علاوہ ازیں آل انڈیا مسلم لیگ کے سرکاری ترجمان منشور (دہلی) کے ایڈیٹر حسن ریاض کی درج کردہ تفصیلات کے لیے دیکھیے، منشور ۷ مئی ۱۹۴۱ء۔

۱۲۔ Speeches and Writings of Mr. Jinnah ۱:۲۶۲۔۲۶۳۔

۱۳۔ Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, Speeches as Gevernor - General of Pakistan. ڈائریکٹریٹ آف ریسرچ (اسلام آباد) ریفرنس اینڈ پبلیکیشنز، (تاریخ ندارد) ص ۵؛ آئندہ اس کتاب کا حوالہ Speeches as G.G. کے تحت آئے گا۔ مندرجہ بالا عبارت کا ایک اور رخ (مسز رفیعہ شریف نے مس جناح پر اپنے مضمون میں جو ۴ مارچ ۱۹۴۹ء کو ''فریڈم کراچی'' میں شائع ہوا تھا درج کیا ہے) یہ ہے:۔ ان پریشانیوں اور سخت محنت کے سالوں کے دوران میری بہن میرے لیے امید اور روشنی کی ایک چمکدار کرن کی طرح تھیں۔ خصوصاً اس وقت جب گھر واپس آتا اور ان سے ملتا۔ اگر ان پر پابندیاں نہ ہوتیں تو میری بیماری اور پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا۔ ان کے ارادوں میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ میں آپ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ ایک وقت تھا جب ہم ایک بڑے انقلاب سے ہمکنار تھے۔ ہم گولی اور موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے انہوں نے کبھی ناامیدی ظاہر نہیں کی اور ہمیشہ میری ہمت بندھاتی رہیں۔ وہ تقریباً دس سال میرے ساتھ رہیں اور مجھے ہمیشہ سہارا دیئے رہیں۔

۱۴۔ اس کو واہگہ بارڈر پڑھا جائے کیونکہ لاہور کے نزدیک کھوکھراپار نہیں بلکہ واہگہ ہے۔

۱۵۔ Speeches as G.G.، ص ۲۹۔۳۰۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۳۰۔۳۱۔

۱۷۔ ایضاً، ص۱۱۴۔

۱۸۔ ایضاً، ص۱۲۰۔

۱۹۔ ایضاً، ص۱۲۶۔۲۸۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۲۱۔ ایضاً، ص۱۵۲۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۵۳۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۵۴۔۱۵۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۵۹۔۱۶۔

۲۶۔ جناح سے انٹرویو کے بعد الٰہی بخش کا بیان یہ ہے: ''مجھے کوئی خاص عارضہ نہیں''۔قائداعظم نے فرمایا: ''سوائے معدے کی خرابی اور تھکان کے جو کام کی زیادتی اور دماغی پریشانیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ میں گذشتہ چالیس سالوں میں ہر روز چودہ گھنٹے کام کرتا رہا ہوں لیکن کسی عارضے کا سامنا نہیں ہوا۔لیکن گذشتہ چند سالوں میں مجھے کبھی کبھی بخار اور کھانسی کی شکایت ہوتی رہی۔بمبئی کے میرے ڈاکٹر اسے پھیپھڑوں کی نالیوں کی سوجن بتاتے تھے۔ معمولی علاج اور آرام کرنے سے میں بالعموم ہفتے عشرے میں تندرست ہو جاتا تھا لیکن کوئی ایک دو سال سے یہ تکلیف زیادہ تیزی کے ساتھ عود کرنے لگی اور اس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔جس سے میں بہت نڈھال ہو جاتا ہوں''۔کوئی تین ہفتے ہوئے سردی لگ جانے کی وجہ سے مجھے بخار اور کھانسی کی شکایت ہوئی۔کوئٹہ کے سول سرجن نے پنسلین کی ٹکیاں تجویز کیں۔اس وقت سے میں یہی ٹکیاں استعمال کر رہا ہوں۔اب کچھ افاقہ ہے، بخار بھی کم ہوگیا ہے لیکن کمزوری بہت زیادہ ہے۔میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی جسمانی عارضہ نہیں۔بلغم کا آنا غالباً معدے کی بناء پر ہے، اگر معدہ ٹھیک ہو جائے تو میں فوراً تندرست ہو جاؤں گا۔کئی سال ہوئے مجھے معدے کی سخت تکلیف ہوئی تھی جس کے لیے میں نے لندن کے بعض ماہرین سے مشورہ کیا لیکن وہ میرے مرض کی تشخیص نہ کر سکے اور ایک نے تو آپریشن تک تجویز کیا۔۔۔۔'' الٰہی بخش Days with the Quaid-i-Azam During His Last.(کراچی: قاوداعظم اکادمی، ۱۹۷۸ء)ص۴۔۵۔

۲۷۔ الٰہی بخش کا مزید بیان یہ ہے: ''اب مجھے مرض کی پوری کیفیت بتا دیجیے۔یہ مرض کب سے ہے؟ مرض پر قابو پانے

کے کیا امکانات ہیں۔ علاج کب تک جاری رہے گا۔ مجھے ان تمام باتوں کا پوری طرح علم ہونا چاہیے۔ آپ مجھے حقیقت حال سے باخبر کرنے میں کسی پس وپیش کا مظاہرہ نہ کریں''۔ میں نے جواب دیا،''میں جب تک ایکس ریز کی مدد سے معلوم نہ کرلوں کہ بیماری کس حد تک پہنچ چکی ہے کوئی خاص رائے نہیں دے سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ جدید ادویہ کے استعمال سے صحت کافی بہتر ہو جائے گی''۔ میری یہ رائے سن کر ان کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی اس بات سے میں بے حد متاثر ہوا کہ اپنی صحت کے بارے میں اتنی پریشان کن خبر کو انہوں نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ سن لیا''۔ ایضاً، ص ۸۔

۲۸۔ الٰہی بخش کے مطابق:''ناشتے کے لیے دلیا، نیم جوش یا تلے ہوئے یا پانی میں پکے ہوئے انڈے، مکھن کے ساتھ ڈبل روٹی کے پتلے پتلے ٹکڑے، بعد میں قہوہ جس میں دودھ کی مقدار کافی ہو، گیارہ بجے پھلوں کا رس، دوپہر کے کھانے کے لیے چوزے کا قیمہ، سفید چٹنی کے ساتھ ابلی ہوئی یا بھاپ میں پکی ہوئی مچھلی، آلوؤں کا بھرتہ، مٹر کے سبز دانے، بعد میں پکا ہوا کسٹرڈ یا کریم کے ساتھ پھلوں کی جیلی، تیسرے پہر کو چائے اور بسکٹ، رات کے کھانے کے لیے چوزے کا قیمہ، بھنی ہوئی مچھلی، بھرتہ، مٹر کے سبز دانے، ابلا ہوا کدو، بعد میں نرم سی پڈنگ اور قہوہ، میں نے تجویز کیا۔ ایضاً، ص ۶۔

۲۹۔ الٰہی بخش کے مطابق:''قائداعظم کو یہ سنگین خبر سناتے وقت میں ان کی طرف غور سے دیکھتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ آیا میں نے ان کو مطلع کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔ بہرحال وہ بڑے سکون کے ساتھ میری تشخیص کا نتیجہ سنتے رہے اور آخر میں صرف اتنا پوچھا کہ''آپ نے مس جناح کو تو نہیں بتایا؟'' میں نے جواب دیا،''جی ہاں عالی جناب، میرا خیال تھا کہ اس بیماری کی اصلیت آپ پر ظاہر نہ کروں کہ کہیں اس سے آپ کی صحت پر برا اثر نہ پڑے، اس لیے مجھے ان کو اعتماد میں لینا پڑا''۔ قائداعظم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا،''نہیں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، آخر وہ عورت ہی تو ہیں''۔ میں نے عرض کیا،''مجھے افسوس ہے کہ میں مس جناح کو رنج پہنچانے کا موجب ہوا لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔۔۔'' ایضاً، ص ۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۹۔

۳۱۔ الٰہی بخش کے بیان کے مطابق: ''سیڑھیوں سے نیچے اترا تو ڈرائنگ روم میں میری ملاقات وزیراعظم سے ہوئی، جو اسی دن مسٹر محمد علی کے ہمراہ قائداعظم کی مزاج پرسی کے لیے زیارت آئے تھے۔ انہوں نے نہایت بیتابی کے ساتھ قائداعظم کی کیفیت دریافت کی اور مجھے مبارکباد دی کہ میں نے مریض کا اعتماد حاصل کرنے کا پہلا مرحلہ بحسن وخوبی طے کرلیا ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ اس کا مریض کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ وزیراعظم نے مجھ کو تاکید کی کہ میں ان کی اس طویل بیماری کی جڑ کا ضرور کھوج لگاؤں۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ قائداعظم کی حالت تشویشناک ہونے کے باوجود پرامید ہے۔ اگر

انہوں نے وہ جدید دوائیں استعمال کرلیں جو کراچی سے منگوائی جارہی ہیں تو ممکن ہے وہ صحت یاب ہوجائیں۔ سب سے امید افزاء بات یہ ہے کہ مریض میں کافی قوت مدافعت ہے۔ میں وزیراعظم کی گہری تشویش سے بہت متاثر ہوا جو ان کو اپنے رہنما اور پرانے رفیق کی صحت کے بارے میں تھی"۔ ایضاً ص ۱۱۔

۳۲۔ Speeches as G.G.، ص ۱۶۲۔۱۶۳۔

۳۳۔ دیکھیے الٰہی بخش کی محولہ بالا کتاب، ص ۱۴۔۱۵۔

۳۴۔ الٰہی بخش کے بیان کے مطابق: میں بہت خوش ہوں، اچھا کیا آپ مجھے یہاں لے آئے۔ زیارت میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں پنجرے میں قید ہوں۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۳۵۔ دیکھیے محولہ بالا کتاب، ص ۲۵۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۳۷۔ اس سال عیدالفطر ۷ اگست کو ہوئی تھی۔ یہ غلطی شاید اس بناء پر ہوئی کہ Quaid-i-Azam Speaks (کراچی: پاک پبلشٹی، ۱۹۵۰ء) میں قائداعظم کا پیغام عید غلطی سے ۲۷ اگست ۱۹۴۸ء کی تاریخ میں درج کیا گیا اور اس کے بعد آنے والی تمام مطبوعات میں اس غلطی کو دہرایا جاتا رہا۔ مس جناح اور مسٹر الانا نے یقیناً انہیں مطبوعات میں سے کسی ایک سے رجوع کیا ہوگا۔

۳۸۔ Speeches As G.G.، ص ۱۶۶۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔

۴۱۔ اوپر فٹ نوٹ ۳۷ میں نشان زد کی جانے والی غلطی کی بناء پر جناح کا ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء پر یوم آزادی کا پیغام ان کے آخری الفاظ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔